ماہنامہ

نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

رفیقِ منزل

جلد: ۳۲ | شمارہ: ۱ | جنوری ۲۰۱۹ء | ربیع الآخر ۱۴۴۰ھ ۔ جمادی الاول ۱۴۴۰ھ

editor@rafeeqemanzil.com

مدیر
سعود فیروز

معاون مدیر
فراز احمد

MANAGER
Abdul Jabbar 09985458236
managerrmgp@sio-india.org

Asst. MANAGER
Saleem Akram 08867255364
asst.managerrmgp@sio-india.org

₹160 سالانہ | ₹15

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Tel: 26949817 | Email:managerrmgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation of India, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor**

بندگانِ خدا کی خدمت

ڈاکٹر وقار انور

مَنْ یَسَّرَ عَلٰی مُعْسِرٍ یَسَّرَ اللّٰہُ عَلَیْہِ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ۔ (عن ابو ہریرہؓ / رواہ ابن ماجہ ۲۴۱۶)

’’جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں آسانی فرمائے گا۔‘‘

دوسرے لفظوں میں اس حدیث کا مفہوم اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ دوسروں کے لیے سہولتیں فراہم کرنے والے شخص کی دنیا اور آخرت کی پریشانیوں کو اللہ تعالیٰ دور کردے گا۔ مسند احمد میں آں حضرتؐ سے مروی ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

’’اِسْمَحْ یُسْمَحْ لَکَ۔‘‘ (رعایت کرو، تمہارے ساتھ رعایت کی جائے گی۔)

ان دونوں طرز کی بہت ساری احادیث کتابوں میں موجود ہیں۔ پہلی حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ بندگانِ خدا کے ساتھ تمہارا جیسا رویہ ہوگا ویسا ہی خدائے بزرگ و برتر کا تمہارے ساتھ ہوگا۔ ایک دوسری حدیث کا مفہوم ہے کہ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ دوسری متذکرہ حدیث میں یہی پیغام معروف (Active) اور مجہول (Passive) انداز میں دیا گیا ہے۔ یعنی تم اچھا برتاؤ کرو تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا۔ اس طرز کی ایک دوسری حدیث قدسی ہے کہ خرچ کرو، تم پر خرچ کیا جائے گا۔ (اِنْفِقْ یَا ابْنَ آدَمَ اُنْفِقْ عَلَیْکَ)

دراصل یہ بات اتنی اہم ہے کہ اسے حضرت محمدؐ نے مختلف پیرائے میں مختلف مواقع پر الگ الگ طریقے سے فرمایا ہے۔ یہ دین اسلام کا خاصہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو راضی کرنا ہے تو اس کی مخلوقات کے حقوق ادا کرنے ہوں گے اور ان کی خدمت کرنی ہوگی۔ خدا کی معرفت جنگلوں اور بیابانوں میں نہیں بلکہ انسانوں کے درمیان ان کے تعلقات کے تقاضے ادا کرکے حاصل ہوگی۔ یہ ایک ’نقد سودا ہے ’اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے‘۔

انسان تعلقات کے درمیان پیدا ہوا ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ان سب تعلقات کے تقاضے پورے کرے۔ پہلا اور بنیادی تعلق اللہ کے ساتھ ہے اور اس کا تقاضہ ہے کہ اس کے ذریعہ مقرر کردہ مراسم عبودیت ادا کرکے اور اس کی کتاب اور رسولؐ کے ذریعے اوامر و نواہی کے احکامات کی پیروی کرکے زندگی گزاری جائے۔ دوسرا تعلق خود فرد کی اپنی ذات کا ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کا تزکیہ کیا جائے اور اسے ظلم سے بچایا جائے۔ تیسرا تعلق جو درج بالا احادیث کا موضوع ہے بندگانِ خدا کے ساتھ تعلقات ہیں۔ انسانوں سے تعلقات کے تقاضے افراد کے درمیان الگ الگ ہوتے ہیں۔ والدین، ازواج، اولاد، پڑوسیوں اور عام انسانوں، سب کے معاملات یکساں نہیں ہیں بلکہ الگ افراد اور الگ مواقع کے تقاضے مختلف ہوسکتے ہیں۔ لیکن ان تمام تعلقات میں ایک اصولی بات یہ ہے کہ ایک فرد صرف اپنی ذات میں گم نہ ہو بلکہ دیگر افراد کی خدمت و ضروریات کی طرف بھی متوجہ رہے۔

درج بالا حدیث جو ہمارے زیرِ مطالعہ ہے، اس میں دو الفاظ یُسر (آسانی) اور عصر (تنگی) استعمال ہوئے ہیں جن پر غور کرنا چاہیے۔ دین اسلام کا تعارف مختلف آیات و احادیث میں یُسر کے طور پر کرایا گیا ہے کیوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رحمت اپنے اوپر لازم کرلی ہے، جس کا ایک اظہار اس طرح کیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے آسانی چاہتا ہے، تنگی نہیں۔ (یرید اللّٰہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر) اور اسی وجہ سے آں حضرتؐ نے تاکید کی ہے کہ آسانی پیدا کرو، تنگی نہ پیدا کرو۔ اور اسی وجہ سے اس دین کے فقہا نے کسی بھی حکم کی تلاش میں یہ اصول سامنے رکھا ہے کہ اسے یُسر اور قابل عمل ہونا چاہیے، یعنی عُسر اور ناممکن العمل نہیں ہونا چاہیے۔

ہم میں سے ہر شخص کو دنیا میں ایسے معاملات پیش آتے رہتے ہیں اور آخرت میں پیش آئیں گے کہ جب ہم اللہ تبارک وتعالیٰ سے سہولت اور عطائے خاص کے طالب ہوتے ہیں اور رہوں گے۔ ایسی خواہش کے حقیقت بنا دینے کا آسان نسخہ یہ ہے اللہ کی مخلوقات کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا جائے اور ان کی خدمت کرکے ان کو راضی کرلیا جائے۔ اِن کو راضی کرنا اُس کو راضی کرنے پر منتج ہوگا، ان شاء اللہ۔

دور حاضر میں جہاں لادینیت، مذہب بیزاری اور اس جیسی اصطلاحات عملی طور پر زور پکڑ رہی ہیں وہیں ہندوستان بھی مغربی طرز زندگی کی طرف راغب ہو رہا ہے جس کی تائید انصاف کے ادارے کر رہے ہیں۔ ہم جنسیت اور Adultery اس کی واضح مثال ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس قسم کی اصطلاحوں کو پر کشش انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اور نوجوان نسل تیزی سے اس جانب گامزن ہے جس میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔

اس پُر آشوب دور میں رفیقِ منزل ان انتہائی اہم و سنجیدہ مسائل پر نوجوانوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ ماہ اکتوبر کا شمارہ مذہب بیزاری پر شائع کیا گیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ الحاد تیزی کے ساتھ سماج میں اپنے پیر پھیلا رہا ہے، اس کو بڑھاوا دینے کے بھی نت نئے ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہیں جن کے مقابلے کے لئے مضبوط قوت ارادی اور ایمان کی ضرورت ہے۔ ان سخت حالات میں نوجوانوں کا فکری ارتقاء اور رہنمائی لازمی ہے۔

ڈاکٹر وقار انور نے اپنے مضمون میں بہت ہی اہم موضوع پر گفتگو کی ہے، یقیناً انسان بڑا ناشکرا ہے، اپنی صلاحیتوں اور کامیابیوں پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے غرور اور تکبر کرتا رہتا ہے اور اللہ ہی ہے جو اپنے نور سے لوگوں کو سر بلند کرتا ہے۔

یقیناً رفیقِ منزل موجودہ دور میں طلبہ کی ایک آواز ہے جو اہم عناوین پر مواد فراہم کرتا ہے، لیکن محض مواد جمع کر لینا کافی نہیں ہے، اس کی وقت پر ترویج و اشاعت بھی لازمی ہے، ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ رفیق وقت پر موصول نہیں ہوتا دوسرا یہ کہ ٹکنالوجی کے اس تیز رفتار دور میں بھی رفیقِ منزل بروقت ویب سائٹ پر دستیاب نہیں ہوتا ہے۔ کم از کم ہر ماہ کے شمارے کی پی ڈی ایف ویب سائٹ پر اپلوڈ کی جائے تا کہ اس کے مواد سے بروقت رہنمائی حاصل کی جائے۔

محمد سلمان، تلنگانہ

نیا سال، نئے تجربے، نئے امکانات

قارئین رفیق کو نیا سال مبارک۔

نئے سال کا آفتاب ہر مرتبہ اک نئی صبح کا امکان لے کر طلوع ہوتا ہے اور گزرے ہوئے سال کی آخری شام ہمارے فکر وخیال کے کینوس پر رنگ بہ رنگ سوالات چھوڑ جاتی ہے۔ سوالات کے سہارے ہم سال رفتہ کا احتساب کرتے ہیں۔ سوال، احتساب اور امکان کی معنی خیز رسہ کشی سے اک نیا سال اور نئے سال سے اک نیا عہد وجود پذیر ہوتا ہے۔ اس نئے عہد میں ہم تازہ توانائی اور تازہ جوش وولولے کے ساتھ داخل ہوتے ہیں۔ یہ تازگی نئے امکانات، نئے تجربات اور ہنگامہ شب وروز کے نئے عنوانات کی نوید ہوتی ہے۔

نیا سال، نیا نہیں ہوتا جب تک نئے تجربات سے کام نہ لیا جائے۔ یہ نئے تجربات ہی ہوتے ہیں جو گردش ایام کو 'نیا' بناتے ہیں اور ان میں نئی زندگی کا امکان پیدا کرتے ہیں۔ ورنہ دن اور رات، ماہ وسال کی روایتی آمد ورفت میں کوئی وجہ کمال نہیں ہے۔ نئے نئے تجربات ہی سے ہماری فکر وخیال، ہمارا طور طریقہ، ہمارا رنگ وآہنگ گہرائی، وسعت اور بلندی سے روشناس ہوتا ہے۔ آگ پیدا کرنے والے پتھر سے لے کر ڈرون حملوں تک انسانی فکر وتمدن کا سفر دراصل انسان کے بوقلمونی تجربات ہی کی داستان ہے۔ تاریخ کے عہد جدید کا ہر صفحہ بھی نت نئے تجربات ہی سے عبارت ہے۔ نئے تجربات انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ہوتے ہیں۔ سیاست ومعیشت کے میدان میں بھی، فکر ونظر کے محاذ پر بھی۔

قوموں کی حیات محض ان کے تخیل پہ موقوف نہیں ہے۔ تخیل بھی اگر جمود کا اسیر ہو جائے تو قومیں بغیر کسی 'خارجی سازش' کے، صفحہ ہستی سے نابود ہو جاتی ہیں۔ زندہ و پایندہ رہنے کے لئے فکر وتخیل کی سطح پر بھی، اور حرکت وعمل کے میدان میں بھی مستقل تجربات ناگزیر ہیں۔ تجربات ہی کے بعد یہ موقع میسر آتا ہے کہ قومیں اپنی فکر ونظر پر نظر ثانی کریں۔ اپنے رنگ وآہنگ کا جایزہ لیں۔ جن قوموں، نظریوں اور ثقافتوں نے نئے تجربات سے راہ گریز اختیار کی، لگے بندھے طور طریقوں پر بضد رہیں، بالآخر وہ تاریخ کے کوڑے دان کی نذر ہو کر رہیں۔ تحریکوں کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ ان کی حیات کا دار ومدار بھی احوال وظروف کے لحاظ سے تجربات پر ہے۔ نظریاتی تحریک کا معاملہ تو سب سے زیادہ نازک ہے۔ اس کی بقاء میں سب سے کلیدی کردار تجربات ہی کا ہوتا ہے۔ نظریاتی تحریک کو بھی فکر ونظر اور حرکت وعمل، ہر دو محاذ پر نئے تجربات کی روایت قائم کرنی ہوتی ہے۔ نظریاتی تحریک کا کار اول وآخر اس کے اپنے نظریے کی ترجمانی ہوتا ہے۔ اس کا ہدف انسانوں کو اپنا ہم خیال بنا کر اپنی نظریاتی اقدار کی بنیاد پر انسان کی حیات اجتماعی کی تنظیم نو کرنا ہوتا ہے۔ یہ تحریک جب تک نئے تجربات سے سروکار رکھتی ہے، زندہ رہتی ہے، اس کا پیغام زندہ رہتا ہے، اس کی معنویت برقرار رہتی ہے۔ انسانی سماج میں مستقل تجربات کے نتیجے میں وہ انسان جن کے مابین تحریک کو اپنے نظریے کی ترجمانی کرنی ہے ان کا مذاق، ان کے مسائل اور ان کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ تحریک بھی اگر لمحہ بہ لمحہ اپنی فکر کا جایزہ نہ لیتی رہے اور اپنے فکر کی پیشکش کو مخاطب انسانوں کے ذوق اور مسائل کے مناسب حال نہ بنائے، اپنی ترجیحات میں سماج کی ترجیحات پیش نظر نہ رکھے تو اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔ اس کی معنویت ختم ہوتی جائے گی۔ اس کے باقی رہنے یا فنا ہو جانے سے سماج کا نہ کوئی فائدہ ہوگا نہ خسارہ۔

موجودہ دور میں انسان مختلف تجربات کے بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کر رہا ہے۔ ہر قدم اور ہر محاذ پر ہر نوعیت کے تجربے کر رہا ہے۔ ان تجربات سے سیکھ بھی رہا ہے اور ٹھوکریں بھی کھا رہا ہے۔ ان تجربات کے نتیجے میں انسان، اس کے بود وباش، اس کے طرز فکر وخیال، اس کی پسند وناپسند، اس کی دلچسپی کے معیار، اس کے ذاتی، عائلی، طبقاتی، قومی اور بین الاقوامی مسائل کی نوعیت میں بنیادی تبدیلی آ گئی ہے۔ اس نے پہلے خدا کو خیر آباد کہا تھا، اب عقل پر لعنتیں بھیج رہا ہے۔ خدا اور عقل سے ہاتھ دھونے کے بعد اب اس کے پاس حیوانی جبلت کے سوا کچھ بچا نہیں ہے۔ خدا سے عقل اور عقل سے حیوانی جبلت تک اس ترقی معکوس نے انسانی زندگی اور انسانی سماج کا منظر نامہ یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ انسانی تاریخ ایک نئی کروٹ کے دہانے پر ہے۔ ایسے حالات میں جدوجہد کرنے والی ایک نظریاتی تحریک، جس کا نظریہ اسلام ہے، کے لئے وقت آچکا ہے کہ وہ اب اپنے فکر کا بے لاگ جایزہ لے۔ اپنے فکر کی موجودہ دور میں معنویت کو دریافت کرے۔ محض فکر نہیں، بلکہ اپنے ورک کلچر، اپنی سرخیوں، نعروں اور اپنی لفظیات پر بھی آمادہ تجزیہ وتبصرہ ہو۔

نئے تجربات اور نئے تجربات کی بات سے برگشتہ ہونے اور اندیشوں کے گرفتار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نئے تجربات بدلتے زمانے میں تحریک کو زندہ رکھنے کی کوشش کا نام ہے۔ اس لئے نئے تجربات ضروری ہیں۔ تجربات نہ کرنے کی وجہ سے تحریک کے افراد کی نظروں سے امکانات اوجھل ہو جاتے ہیں۔ راہیں مسدود نظر آنے لگتی ہیں۔ پھر یہ افراد یا تو مایوسی کے تاریک جزیروں میں پناہ گزیں ہوتے ہیں یا انتہا پسندی ان کا وصف امتیازی قرار پاتی ہے۔ تجربات نہ کرنے کی وجہ سے ناکارآمد تحریکی روایات کے گرد وپیش تقدس کا ہالہ وجود میں آنے لگتا ہے۔ اس قسم کی روایتیں بھی، نوتراشیدہ بت بن جاتی ہیں۔ سفر شوق میں یہ روایتیں زنجیر پا بن جاتی ہیں۔ جب بھی تحریک کے نصب العین کی کامیابی کا تقاضہ ہو، تجربات سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ تجربات برائے تجربات مطلوب نہیں ہیں، تجربات برائے ترقی مقصود ہیں۔ تجربات برائے ترقی تبھی ممکن ہیں جب ہر نئے تجربے کی پشت پر اپنے نظریے سے سچا عشق، اصولوں سے گہری وابستگی،، حالات کا صحیح ادراک، اور دانشورانہ تدبر وحکمت کارفرما ہو۔

سعود فیروز

س۔ دوسالہ میقات کے آغاز کے وقت آپ کی ترجیحات کیا تھیں؟ اس سلسلے میں کیا راہیں اختیار کی گئیں؟

ج۔ ہمارے سامنے ابتداء سے یہ بات رہی کہ ہم سماجی مسائل کو کیمپس میں موضوع بحث بنائیں گے۔ اسی طرح کیمپس کے جو مسائل ہیں انہیں ہم سماج کے سامنے لائیں گے۔ ان دو اہم موقف کے ساتھ ہم نے اپنی میقات کا آغاز کیا۔ اس وقت ملک کے جو حالات تھے مثلاً تعلیمی اداروں پر مرکزی حکومت کی جانب سے جو شکنجہ کسا جا رہا تھا اس کو روکنے کی کوشش کی۔ حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر روہت ویمولا اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے طالب علم نجیب احمد کے ایشیوز سامنے آئے۔ خاص طور سے نجیب احمد کے ایشیو کے ذریعے معلوم ہوا کہ ملک میں ایک ایسا ماحول بنایا جا رہا تھا کہ مسلم طلبہ ڈر جائیں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے کی ہمت نہ کریں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مسلم طلبہ کی نمائندگی پہلے سے ہی بہت کم ہے۔ لیکن لوگ اسے بھی برداشت نہیں کر پا رہے ہیں۔ اقلیتی طبقات سے تعلق رکھنے والے طلبہ کو حاشیے پر رکھنے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ لہٰذا ان ایشیوز پر کام کرنے کے لئے ہم آگے بڑھے۔ حکومت کی قومی تعلیمی پالیسی میں بھی واضح طور پر جانبداری نظر آئی۔ لہٰذا ہم نے قومی تعلیمی پالیسی پر بھی اثر انداز ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

مکالمہ: برادر نحاس مالا

(سابق صدر، ایس آئی او آف انڈیا۔ میقات 18-2017ء)

مکالمہ کار: اسامہ اکرم

”کیمپس میں جدوجہد کو جاری رکھنے، تیز تر کرنے اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے“

س۔ تنظیم میں سوچنے سمجھنے والے ممبران کی جانب سے ایک شکایت اکثر سامنے آتی ہے کہ تربیت اور ایکٹیوزم کے حوالے سے تنظیم عدم توازن کا شکار ہے۔ تربیت و تزکیہ کی بجائے ایکٹیوزم کی طرف تنظیم کا جھکاؤ زیادہ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ تربیت اور ایکٹیوزم، یہ دونوں دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ ایکٹیوزم ہی تربیت ہے اور تربیت ہی ایکٹیوزم ہے۔ ان میں سے ایک کا اہتمام کرنے سے دوسرے کو تقویت ملتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم تزکیہ سے متعلق کوئی کام کرتے ہیں تو اسے محض تربیت سمجھتے ہیں، ایکٹیوزم نہیں۔ جب ہم ایشیوز پر کام کرتے ہیں تو اس کو محض ایکٹیوزم سمجھتے ہیں، تربیت نہیں۔ یہ طرز فکر مناسب نہیں ہے۔ ہم مختلف ایشیوز پر سوچ سمجھ کر جو موقف لیتے ہیں اس کا تعلق تربیت سے بھی ہے اور ایکٹیوزم سے بھی۔ اسی طرح خالص تربیتی سرگرمی بھی ہمارا ایکٹیوزم ہی ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے ان دونوں میں خط امتیاز کھینچ دیا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں ایکٹیوزم زیادہ ہے، تربیت کم ہے۔ یا ہمارے یہاں تربیت پر زور زیادہ ہے، ایکٹیوزم پر نہیں۔ اصل مسئلہ تنظیم اور تحریک کی صحیح سمجھ کا ہے۔ جب تک ہمارا تحریکی شعور بالیدہ نہیں ہوگا، اس طرح کے مباحث جاری رہیں گے۔ یہ بات ہمیشہ پیش نظر ہونی چاہیے کہ کوئی بھی تنظیم، تنظیم برائے تنظیم وجود میں نہیں آتی۔ بلکہ اس کا وجود کچھ بڑے مقاصد اور نصب العین کے حصول کے لئے ہوتا ہے۔ انہی مقاصد کے حصول کی جدوجہد کو ہم تحریک کہتے ہیں۔ تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے، اسے آگے بڑھانے کے لئے ایک تنظیمی ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ تنظیمی ڈھانچے الگ الگ ملکوں میں، الگ الگ ریاستوں میں مختلف ہوسکتا ہے، اور ہے۔ لیکن تحریک کے سفر میں کبھی کبھی وہ موڑ آجاتا ہے جہاں تحریک خالص تنظیم میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ تحریک کا اصل کام پس پشت چلا جاتا ہے۔ پھر ہم تحریکی جدوجہد کو تربیت اور اس جیسی دوسری اصطلاحات میں قید کردیتے ہیں۔ حالانکہ تربیت تو درحقیقت جدوجہد اور سرگرمی ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔

س۔ ملک کی سیاسی وسماجی صورت حال کی اصلاح کے لئے آپ ایس آئی او کے طلبہ ونوجوانوں کو کس حد تک تیار پاتے ہیں؟

ج۔ میں صرف اس ملک کے نہیں بلکہ تمام نوجوانوں کی قوت تسخیر میں یقین رکھتا ہوں۔ کیوں کہ نوجوان اور نئی نسل ہی کسی بھی ملک، ملت اور تحریک کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ زمانے کی فتنہ سامانیوں کے علی الرغم میرا خیال ہے کہ خود وطن عزیز ہندوستان میں بھی اس وقت عوام میں اصل رجحان خیر اور بھلائی کا ہے شر اور بدی کا نہیں۔ تاریخ کے ہر دور کی طرح حق اور باطل کی کشمکش اس وقت بھی جاری ہے۔ لیکن حق بالآخر سرکرو ہوکر رہے گا، ان شاء اللہ۔ قرآنی آیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ حق اور باطل میں جو فرقِ بین ہے، انسانیت فطری طور پر اسے محسوس کرے گی۔ میں نے تنظیم کے ذمہ دار کے طور پر ملک کے طول وعرض کا سفر کیا۔ میں خاص طور پر اپنے آخری دورے کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ دورہ جھارکھنڈ کا تھا۔ جس دن وہاں میرا پروگرام تھا اس کے اگلے دن وہاں ریاست کے وزیر اعلی کا دورہ تھا۔ وزیر اعلی کے پروگرام میں ریاست جھارکھنڈ کے سب سے بہترین گرام پنچایت صدر کے اعزاز سے ایس آئی او کے ایک سابق رکن کو نوازا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ریاست جہاں ہجومی تشدد کے متعدد سانحے رونما ہوچکے ہیں، اسی ریاست میں ہمارے نوجوان تعمیری اقدار کے ساتھ سرگرم عمل بھی ہیں۔ سماجی تانے بانے کو مضبوط کرنے کے لئے سرگرداں ہیں۔ صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کر رہے ہیں اور انعام واکرام سے نوازے جارہے ہیں۔

س۔ ملک کی موجودہ صورت حال میں طلبہ تحریکیں کیا کردار ادا کرسکتی ہیں؟ ایس آئی او کا کردار کیا ہونا چاہیے؟

ج۔ کیمپس میں ہمیں اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے، تیز تر کرنے اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ جدوجہد محض اپنے حقوق کی بحالی کے لئے نہیں بلکہ انصاف پر مبنی ایک سماج کی تشکیل کے لئے جاری رکھنی چاہیے۔ اس وقت سرگرم عمل بہت ساری طلبہ تحریکوں کی جدوجہد حقوق اور انصاف کے مطالبات تک محدود ہے۔ اصل کام یہ ہے کہ آپ انصاف کے مطالبے کی سطح سے آگے بڑھ کر انصاف قائم کرنے کی پوزیشن میں آئیں۔ اس راہ میں ہمیں بہت سارے چیلنجز کو انگیز کرنا ہوگا۔ اپنا قیمتی وقت، دولت اور صلاحیت اس راہ میں صرف کرنی ہوگی۔ اس کام کو اپنا فرض سمجھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ دیگر طلبہ تنظیموں کے ساتھ کام کرنے کے سلسلے میں میرا خیال ہے کہ مشترک ایشیوز پر جدوجہد کرنے کے لئے تمام طلبہ تنظیموں کو بقائے باہم اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی راہیں ہموار کرنی چاہیے۔ آپس میں ایک دوسرے کے تعاون کے سلسلے کو دراز رکھنا چاہیے۔

س۔ پانچ ریاستوں کے حالیہ اسمبلی انتخابات کے نتائج پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟

ج۔ بلاشبہ پانچ ریاستوں کے اسمبلی انتخابات کے جو نتائج آئے ہیں وہ کسی حد تک ہمارے لئے خوشی کی بات ہے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ محض چہروں کا بدل جانا ہندوستانی عوام کے بے شمار مسائل کا اصل حل ہرگز نہیں ہے۔ بحیثیت ایک ہندوستانی شہری، ہمیں اس پر مباحثہ کرنا ہوگا کہ جمہوری فریم ورک میں رہتے ہوئے موجودہ نظام کو ہم کیسے بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح بحیثیت ایک نظریاتی تحریک آپ کیا حل اور متبادل پیش کرتے ہیں، یہ ایک اہم سوال ہے۔

س۔ وابستگان ایس آئی او کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

ج۔ موجودہ پرآشوب دور میں ایس آئی او کے وابستگان، ملت اسلامیہ کا انمول سرمایہ ہیں۔ الحمدللہ ہمارے کیڈرس اپنے قائدین کے لئے سراپا سمع وطاعت ہیں۔ اپنی گونا گوں صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کرتے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ مکمل طور پر اپنے قائدین پر انحصار کرنے کی بجائے، خود قائدین کو نئے اور انوکھے آئیڈیاز فراہم کرنے والے بنیں۔ اپنی صلاحیتوں کے معیار کو اس حد تک بلند کریں کہ ہماری تحریک انسانی زندگی کے ہر محاذ پر اثر انداز ہوسکے۔

نظر

تعلیم کا داخلی استعمار

جسیم پی پی
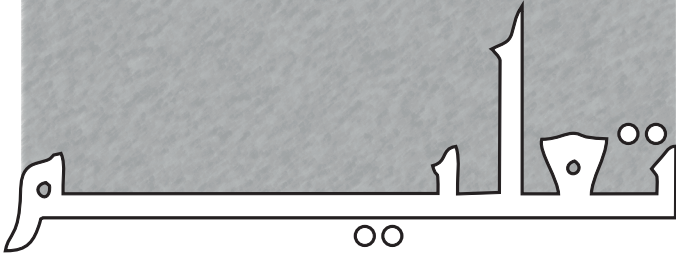
میلکم ایکس نے کہا تھا کہ ”تعلیم مستقبل کی کنجی ہے کل یہ ان کے پاس ہوگی جو اس کے لیے آج تیاری کریں“۔

میلکم ایکس کا یہ قول صحیح ہے لیکن ہندوستان میں اس کنجی کا حصول مشکل تر ہو چکا ہے۔ کیونکہ تعلیم کا حصول یہاں صرف سماج کے بعض طبقات کے لئے ہی مخصوص کر دیا گیا ہے۔ جس میں نظریہ ذات پات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس شیطانی عمل کی حقیقت کو جاننے کیلئے میں یہاں ایک فلم ”ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر: دی ان ٹولڈ ٹروتھ“ کے کچھ حصوں کو آپ کے علم میں لانا چاہوں گا۔ فلم میں امبیڈکر سے ان کے پروفیسر کہتے ہیں ”آپ کی جدوجہد بھارت کی جدوجہد آزادی سے بھی بڑی ہے۔“ جبکہ انہیں اپنے تحقیقی مقالے پیش کرنے کے بعد محفل کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اسی پروفیسر نے بھارتی جدوجہد آزادی کے حوالے سے امبیڈکر کے نقطہ نظر کے سلسے میں شکایت کی۔ ایک بار لالہ لاجپت رائے نے امبیڈکر سے مطالبہ کیا کہ وہ آزادی ہند کے بارے میں آکر گفتگو کریں۔ لیکن امبیڈکر نے شرکت سے انکار کر دیا۔ اسی واقعہ کا پروفیسر نے حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ امبیڈکر کے مقالے بھارتی جاتیوں، ان کی ترقی اور طریقہ کار پر مبنی ہیں۔ یہ پروفیسر کے لئے ہندوستانی سماجی ڈھانچے، ذات پات کا نظام اور نچلی جات کے لئے آزادی وانصاف کیلئے امبیڈکر کی جدوجہد کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے ایک بصیرت افروز مطالعہ تھا۔ جس کے بعد پروفیسر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ امبیڈکر کی جدوجہد نچلی جاتیوں کی آزادی وانصاف کے لئے تھی۔ اس فلم میں یہ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ امبیڈکر کی تعلیمی زندگی جدوجہد پر مبنی اور ساری زندگی باوقار تھی۔ نچلی ذاتوں کو حق تعلیم سے بالکل محروم کر دیا گیا تھا۔ پوری فلم ذات پات کے نظام کے متعلق ہندو نظریہ پر مبنی ہے۔ جس میں اس رواج کو دکھایا گیا ہے کہ نچلی ذات والوں کو چاہئے کہ وہ اعلیٰ ذات والوں سے بات نہ کریں اور ان سے دوری بنائے رکھیں۔ اعلیٰ ذات والے نچلی ذات والوں کی موجودگی میں کبھی وید نہ پڑھیں اور کوئی نچلی ذات کا فرد اگر وید کے الفاظ سن لے تو اس کے کان میں پگھلا ہوا لوہا ڈالا جاتا اور اگر وید پڑھ لے تو اس کی زبان کو کاٹ دیا جائے۔ خود امبیڈکر کو غیر برہمن ذات کا حوالہ دے کر وید پڑھنے سے روک دیا گیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال تھا کہ ”تعلیم ایسی چیز ہے جسے ہر کسی کے لئے مہیا کرنا لازمی ہے۔ اسی طرح سے ایسی پالیسی کا ہونا لازمی ہے جس کے ذریعہ سماج کے نچلے طبقات کے لئے تعلیم کو سستا بنایا جاسکے۔ اگر تمام کمیونٹی کو برابری کے ساتھ یہ چیز مہیا کی جانے لگے، تو اس کا ایک ہی حل ہوگا کہ مساوات کو اپنایا جائے اور سماج کے نچلے طبقات کو رعایت دی جائے۔“

مقصد تعلیم اور اس کی رسائی پر توجہ مرکوز ہونی چاہئے۔ میلکم ایکس (امریکی سیاہ فام آدمیوں کے انصاف کے لئے لڑنے والا) اور ڈاکٹر امبیڈکر کی جدوجہد مندرجہ بالا حوالہ جات کی ترجمانی کرتی ہے۔ خود امبیڈکر نے اپنے تعلیمی دور میں کئی رکاوٹوں کا سامنا کیا۔ کیونکہ صرف اعلیٰ ذات کے افراد کو ہی تعلیم کے مواقع حاصل تھے۔ امبیڈکر نے اپنی پوری زندگی ان ہی مسائل (استعمار اور بھید بھاؤ) سے لڑنے میں گذاری۔ آج بھی استعمار بھارت میں نظر آتا ہے جو تعلیمی پالیسیوں اور منصفانہ آواز کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ کچھ طاقتور گروہ عوام کا استحصال کرنے کے لئے منصوبہ بند انداز میں کوشاں ہیں۔ آج وقت کی اہم ضرورت ہے اس استعمار کے خلاف کھڑے ہوں جو معاشرے کے بعض گروہوں کو حق حصول تعلیم سے محروم کر دیتا ہے۔

ادارہ جاتی تشدد اور تفریق

جس دیش میں تعلیمی اداروں کو ملک کے مندر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہاں اس طرح کا برتاؤ کیا جارہا ہے۔ اس طرح کا غیر امتیازی سلوک مختلف موقعوں پر انسٹی ٹیوشنل تشدد کی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے روہت ویمولا کے قتل نے ملک کے معزز تعلیمی اداروں کی جانب سے ہو رہے تشدد اور خراب برتاؤ کی حقیقت کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ تعلیمی اداروں میں بڑھتے ہوئے تشدد کے خلاف طلبہ برادری نے آواز اٹھاتے ہوئے روہت ایکٹ کو نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ اس ایکٹ کے ذریعہ تعلیمی اداروں میں ہو رہے

امتیازی سلوک کو مٹایا جاسکتا ہے۔ جے این یو میں اے بی وی پی سے جھگڑے کے بعد نجیب احمد کو غائب کر دیا جانا، کٹیہار میں میڈیکل طالب علم ڈاکٹر فیاض کا قتل، بہار اور دیگر مقامات پر اس طرح کے واقعات کو نوٹ کیا گیا۔ بدقسمتی سے حکومت نے اس طرح کے واقعات کی روک تھام کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔

تعلیمی اداروں میں زیادتی کے واقعات سے صرف نظر، موجودہ تعلیمی پالیسی سماج کے بیشتر مظلوم طبقات، جن کی نمائندگی بہت کم ہے، ان کی حالت کو مزید بدتر بنا رہی ہے۔ معیاری تعلیم اور حصول تعلیم کے یکساں مواقع کا فقدان، اور ان مسائل کے حل میں غفلت کی روش اس کی واضح علامتیں ہیں۔ اب وقت ہے کہ حکومت کی بہوجن مخالف تعلیمی پالیسیوں، بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے حصول میں حکومت کے امتیاز برتنے کے رویے کا پردہ فاش کیا جائے۔ مودی حکومت کے اقتدار میں آجانے کے بعد یہ رجحان مزید بڑھ گیا ہے۔ ایسی بہت سی پالیسیاں ہیں جس کے نتیجہ میں غریب اور امیر، طاقت ور اور کمزور، اعلی طبقے اور نچلے طبقے کے درمیان شدید عدم مساوات پروان چڑھ رہی ہے۔ عدم مساوات پر مبنی اس نظام کا شکار ہمیشہ پچھڑے طبقات ہوتے ہیں۔ ان مسائل کو مخاطب کرنے کے بجائے حکومت اس بحران سے پہلوتہی کر رہی ہے۔ تعلیمی میدان میں ہوئی گزشتہ ترقی کا جائزہ بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے۔

داخلی استعمار کا استحکام

اگرچہ مسلمانوں، دلتوں، آدیواسیوں اور او بی سیس کی حالت پہلے ہی بدتر ہے۔ اس کے باوجود حکومت انہیں وہ مواقع نہیں دے رہی ہے جس کی بناء پر وہ اس حالت سے ابھر سکیں۔ مختلف اعداد وشمار اس کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ اعلی تعلیم کے سلسے میں وزارت انسانی وسائل کے ذریعہ کئے گئے آل انڈیا سروے کو مطابق 17-2016 میں مسلم طلبہ کی تعداد صرف 9۔4 فی صد تھی۔ اور مسلمانوں کی کل آبادی 14 فی صد ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مسلمان کو اعلی تعلیم کے حصول میں بڑے فقدان کا سامنا ہے۔ مسلمانوں کی بدحالی کے سلسلہ میں سرکاری دستاویز موجود ہونے کے باوجود حکومت اب تک کوئی اقدام کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے بالمقابل MANF فیلوشپ جو اقلیت کے لئے خاص ہے اس کے سلسلے میں حکومت بھونڈے قوانیں نافذ کر رہی ہے۔ اقلیتی طلبہ کے لئے اعلی تعلیم حاصل کرنے کا MANF ہی واحد مالیاتی امداد کا ذریعہ ہے۔ نئے سرکاری اعلان کے ذریعہ UGC NET کو تعلیمی وظیفہ حاصل کرنے کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اقلیتی طلبہ اعلی تعلیم سے مزید محروم ہوجائیں گے۔ حکومت کا یہ قدم اقلیتی طبقات بشمول مسلمانوں کو خاص طور پر ریسرچ کے میدان میں معمولی نمائندگی سے بھی محروم کر دے گا۔

یو جی سی قانون کے نتیجہ میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سیٹ کم ہوگئی ہیں۔ جو ملک میں اقلیتی طبقہ کو حاصل ہونے والے مواقع کے لئے نقصاندہ ہے۔ اس قانون کے مطابق ایم فل اور پی ایچ ڈی طلبہ کی تعداد کم ہوگی۔ ایک پروفیسر ایک وقت میں صرف 3 سے 8 طلبہ کی نگرانی کرسکتا ہے، ایک ایسوسیٹ پروفیسر 2 ایم فل اور 6 پی ایچ ڈی کے طلبہ اور ایک اسسٹنٹ پروفیسر 1 سے 4 طلبہ کی نگرانی کرسکتا ہے۔ ایک یونیورسٹی میں ریسرچ سیٹ کا تعین اساتذہ کی تعداد کے مطابق ہوگا۔ اس سے پہلے تک یونیورسٹی کے شعبے خود طلبہ کی تعداد متعین کرتے تھے۔ مثلا جے این یو میں 18-2017 میں سیٹس کی تعداد 1000 سے کم ہوکر 194 ہوگئی۔ یہی معاملہ ملک کی کئی یونیورسٹیوں کا ہے۔ یہ صورت حال ریزرویشن کے نفاذ میں بحران پیدا کرے گی۔ اگر ایک شعبہ میں صرف ایک ایم فل اور پی ایچ ڈی سیٹ ہے تو وہاں ریزرویشن حاصل نہیں ہوگا۔ یہ یقینی طور پر ریزرویشن کی مستحق طبقات کے لئے زیادہ نقصاندہ ثابت ہوگا۔ یہ قانون پسماندہ طلبہ کو اعلی تعلیم کے حصول اور خصوصاً ریسرچ سے جبراً دور کرے گا۔

وزارت انسانی وسائل کا نیا فیصلہ جو کچھ مخصوص یونیورسٹیوں کو خودمختاری کی حیثیت دے گا۔ یہ فیصلہ بھی سماج کے کمزور طبقات پر برا اثر ڈالے گا۔ ماہرین تعلیم کا ماننا ہے کہ یہ فیصلہ اہم عوامی اداروں کی نجکاری کرنے کا ایک قدم ہے۔ یہ فیصلہ غریب اور ذہین طلبہ کو عوامی اداروں میں اعلی تعلیم کے مواقع سے محروم کر دے گا۔ ان اداروں کو خودمختاری حیثیت دینے کے نتیجہ میں یہ ادارے یو جی سی کی منظوری کے بغیر نئے کورسز شروع کریں گے۔ جس میں یو جی سی ان کورسز کو پڑھنے میں کسی طرح کی مالی مدد کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ اور فنڈ جمع کرنے کی ذمہ داری مکمل طور پر اس ادارہ کی ہوگی۔ جس کے نتیجہ میں فیس بڑھائی جائے گی اور ریزرویشن ختم کر دیا جائے گا۔

وزارت انسانی وسائل کی جانب سے ایک دوسری تجویز یہ ہے کہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن آف انڈیا ایکٹ 2018، کو متعارف کرایا جائے۔ جس کو پیش کرنے کا مقصد یو جی سی کا خاتمہ ہے۔ موجودہ حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے ہی یو جی سی کے اختیارات کو کم کرنے کے متعدد اقدامات مرکزی وزارت کے ذریعہ ہوئے ہیں۔ 15-2014 کے درمیان یو جی سی کا بجٹ 8906 کروڑ تھا جو اب کم کر کے 4692 کر دیا گیا ہے جو مندرجہ بالا دعوے کا ثبوت ہے۔ اس تجویز کے مطابق HEIs کے فنڈ کی تقسیم یو جی سی کے بجائے نیو ہائیر ایجوکیشن کمیشن کرے گا۔ اس کمیشن کے پاس ایک مستقل ممبر بھی نہیں ہے۔ یہ اعلی تعلیم کی فنڈنگ کو سیاسی رخ دے گا جس کے نتیجہ میں اعلی تعلیمی اداروں میں معیار اور حصول تعلیم میں زبردست تخفیف ہوگی۔

اقلیتی آبادی کے شہر اور اضلاع بھی اعلی تعلیمی معیار رکھنے والے اداروں اور وسائل کی حصولیابی میں عدم مساوات کا شکار ہیں۔ یہاں تک کہ سچر کمیٹی اور دوسری رپورٹس نے ایم سی ڈیز میں نئے تعلیمی ادارے بشمول یونیورسٹیز کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن حکومت نے ان فیصلوں کا نفاذ نہیں کیا۔ اقلیت، ایس سی اور ایس ٹی سے تعلق رکھنے والے طلبہ نے حق تعلیم کی غیر مساوی تقسیم کے خلاف آواز بلند کی۔ ہریانہ میں میوات اور کیرالا میں ملاپرم اس عدم مساوات کی سب سے واضح مثال ہیں۔ مختصراً، تعلیمی اداروں میں موجودہ حکومت نے اندرونی طور پر قابض ہونے کے لئے کئی اقدامات کئے ہیں۔ حکومت کے ان امتیازی اقدامات کو منظر عام پر لانے کے لئے ہم طلبہ کو چاہئے کہ اس کے خلاف ملک کے کونے کونے میں مہم کا آغاز کریں۔

مصنف، ایس آئی او آف انڈیا کے نیشنل سکریٹری ہیں۔

اسکولی سطح پر ذات پات

سعادت حسین

تعلیم میں عدل وانصاف کی بات بہت سارے ماہرین تعلیم نے کی ہے۔ جیسے امرتیا سین نے تعلیم میں ''عدل'' کی بات تو گیتا نمبیسان نے تعلیم میں ''مساوات'' کی بات کی ہے۔ ماہرین تعلیم عدل، انصاف اور مساوات کو متبادل کے طور پر پیش کرتے آ رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی عدل، انصاف اور مساوات متبادل ہیں؟ اس سوال کا جواب نہ دے کر میں اسے قارئین پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اس مضمون میں یہ کوشش کی جائے گی کہ تعلیم میں عدل و مساوات کی ایک وسیع تعریف کو پرائمری اسکولی سطح پر کیسے دیکھا جائے گا جہاں ذات پات کی بنیاد پر کلاس روم اور اس کے باہر تفریق کی جاتی رہی ہے۔ اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کے کیسے اور کن موڑ پر اسکولی سطح پر بھید بھاو ہوتا آ رہا ہے۔

تعلیم میں مساوات، عدل اور انصاف کی جب بات کی گئی زیادہ تر ماہرین تعلیم نے اسے صرف ایک دائرے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان میں کچھ ماہرین نے اس سے پرے جا کر بھی اس مسئلے کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ گیتا نمبیسان (1996)، ستیش دیشپانڈے (2013)، ان میں سی۔ ایم۔ ملیش اور پی۔ وی۔ الاورسن (2016)، اور انوپ کمار (2017) نے اسکولی سطح پر، انجینئرنگ اور دیگر اعلی تعلیمی تناظر میں تعلیم میں عدل و مساوات کو روایتی تعریف سے صرف نظر کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

تعلیم میں عدل ومساوات کو روایتی طور پر ایسے دیکھا گیا ہے کہ کس سماج سے(Persons with, Women, Minorities, OBC, ST,S C disabilities-PWD) کتنے لوگ تعلیم کے الگ الگ مرحلوں میں شامل ہو رہے ہیں یا نہیں۔ ملیش اور الاورسن نے اس محدود تعلیم میں عدل ومساوات کی تعریف میں تصحیح کرتے ہوئے تعلیم میں مساوات کو تین حصوں میں بانٹا ہے۔ جو تعلیم کے الگ الگ مراحل بھی ہیں۔ ان کا تصور مساوات باقی ماہرین تعلیم سے کافی وسیع نظر آتا ہے۔ جسے مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کرکے سمجھانے کی کوشش کی ہے:-

1۔**رسائی کے منصفانہ مواقع**(Equity of Access): اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ کون کون سے سماجی پس منظر سے لوگ آرہے ہیں۔ اس میں حاشیہ پر رہنے والے سماجی گروہوں(Minorities, OBC, ST,S C , Persons with disabilities-PWD,Women) کی موجودہ صورتحال پر خاص توجہ دی جائے گی۔

2۔ **تعلیمی زندگی میں منصفانہ تجربات** (Equity of Experience): جس کے مطابق حاشیہ سے اسکول/کالج/جامعات میں داخلے کے لئے آنے والے سماجی گروہوں کا داخلی تجربہ کیا ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک دلت طالب علم کا ذات پات کی بنیادوں پر تفریقی رویہ کا شکار بننا یا ایک مسلم کا مسلم ہونے کے سبب نفرت کا شکار بننا۔ یہ ممکن ہے کہ اس طرح کا رویہ اپنے ہم جماعت طلبہ/سینئر/جونیئر سے یا اساتذہ سے بھی ہوسکتا ہے۔

3۔**حصول و نتائج کے اعتبار سے منصفانہ مواقع** (Equity of Outcome): جس کے مطابق طلبہ جو حاشیہ سے آنے والے سماجی گروہوں سے تعلق رکھتے ہوں آیا وہ اپنی تعلیمی دور کے ہر مرحلوں کو بحسن خوبی مکمل کریں گے یا درمیان میں تعلیم چھوڑ دیں گے۔ اعلی تعلیمی سطح پر یہ بھی دیکھا جائے گا کہ ان میں سے کتنے طلبہ ایسے ہوں گے جو اعلیٰ تعلیمی مراحل میں پہنچنے کے علاوہ اس کو مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ ملازمت (Job) میں بھی اپنے قدم جمائیں گے۔

اس مضمون میں اوپر بیان کئے گئے دوسرے نقطہ پر پرائمری اسکولی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ ستیش دیشپانڈے نے کہا تھا:

the notion of empirical evidence [in critical studies of higher education[has rarely ventured beyond aggregate statistics the experiences of those engaged in translating rules and schemes into living reality are an important part of the evidence to be considered. (P3, 2013)

اسکا مطلب یہ ہوا کہ تعلیم میں عدل ومساوات کی جب بات ہوگی تو وہ صرف اعداد وشمار تک محدود نہ رہ کر سماج میں حاشیہ سے آنے والے طلبہ کے تجربات، احساسات اور ان کی آپ بیتی بھی اہمیت کی حامل ہوگی۔ جس کو ملیش اور الارسن نے Equity of Experience کا نام دیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تجربہ یا ایکسپیرئینس (Experience) کیا ہے؟ پروفیسر ساروکائی کہتے ہیں:'' ایکسپیرئینس بنیادی طور پر ایک احساس ہوتا ہے''۔ (2012,P.47) احساس ہر فرد کے لئے الگ الگ ہوسکتا ہے جس کو ساروکائی نے آگے Subjective Experience کہا۔ اس احساس کو وہی صحیح طریقہ سے بیان کرسکتا ہے جو اس سے گزرا ہو۔ ایک آدمی کتنا بھی کسی کے قریب ہو لیکن پہلا آدمی دوسرے آدمی کا احساس مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ پہلا آدمی پوری طرح سے دوسرا آدمی نہ بن جائے جو کہ ناممکن بات ہے۔ مثلاً کسی کو وائرل بخار ہو تو صرف وہی صحیح طریقہ سے اپنی تکلیف کو بیان کرسکتا ہے۔

ہندوستانی سماج صدیوں سے ذات پات کے گہرے مرض کا شکار ہے۔ بابا صاحب امبیڈکر نے اس نظام کو Graded inequality بھی کہا ہے۔ اس مرض کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ یہ ذات پات کا نظام مسلم اور عیسائی سماج میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ایک نچلی ذات کا بچہ جب جدید تعلیم کے حصول کے لئے ایک اسکول میں داخلہ لیتا ہے تو وہاں بھی وہ ذات پات کی بنیادوں پر بھید بھاؤ کا سامنا کرتا ہے۔ جس کی کئی مثالیں ہندوستانی اسکولوں میں ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ کیرل جو خواندگی میں اپنا نام رکھتا ہے وہ بھی اس مرض سے آزاد نہیں ہے۔ اسکول کے الگ الگ مرحلوں میں الگ الگ قسم کے بھید بھاؤ پائے جاتے ہیں۔ جن کو اس مضمون میں کیس اسٹڈیز کے حوالے سے واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

1-داخلے کے وقت:

آج بھی ہندوستان میں آر۔ٹی۔ای کے آنے کے باوجود سماج میں بڑے پیمانے پر یہ سمجھا گیا ہے کہ سرکاری اسکول صرف نچلی ذاتوں اور پچھڑے طبقات (ہندو اور مسلمانوں) کے لئے ہوتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان میں اونچی ذات کے بچے داخلہ نہیں لیں گے کیوں کہ یہاں نچلی ذات اور پچھڑے طبقات سے آنے والے طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال کیرل کے پیرامبرا سرکاری اسکول کی ہے جو کالی کٹ سے 40 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ اس اسکول کا نام گورنمنٹ ویلفیر لوئر پرائمری اسکول اور اسکی شناخت صرف دلتوں کے لیے بن گئی ہے۔ یہاں کے ہیڈ ماسٹر رگھوناتھ تھیٹائیل کا کہنا ہے کہ کل 12 طلبہ 4 درجات میں تعلیم حاصل کررہے ہیں ہماری کوششوں کے باوجود صرف دلت طلبہ ہی داخلہ لے پارہے ہیں، اچھا انفراسٹرکچر ہونے کے باوجود پچھلے دس سالوں سے کئی اونچی ذات کے طلبہ نے داخلہ نہیں لیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ اسکول کا Stigmatization بھی ہے۔ ایک ٹیچر کا کہنا ہے کہ اس اسکول میں اونچی ذات کے طلبہ اس لئے داخلہ نہیں لیتے ہیں کیوں کہ وہ پریئہ قوم (دلت گروہ) کے ساتھ نہیں بیٹھنا چاہتے۔ حال ہی میں ایک آٹھ سالہ طالب علم نے کہا تھا (جس کو ایک ٹی وی رپورٹر نے رپورٹ کیا) کہ اس کو پریئہ کہہ کر کالونی میں ذلیل کیا جاتا ہے۔

یہ صورتحال تعلیم میں اپنا مقام بنانے والی ریاست کیرلا کی ہے۔ تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کی باقی ریاستوں میں کیا صورتحال ہوسکتی ہے۔

2۔ کلاس روم میں تفریقِ ذات:

کلاس روم میں ذات پات کی الگ الگ شکلیں ہیں۔جن پر کوئی سرکاری رپورٹ بھی نہیں ہوتی ہیں ۔ گیتا نمبیسان اور مونا سیڈوال (2002) نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ان دونوں نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ اس طرح کے رویہ اساتذہ سے بھی، ہم جماعتوں سے بھی، (Curriculum and pedagogy) سے بھی نظر آتی ہیں۔ان چیزوں کے علاوہ دلت طلبہ کے عزت نفس کے سوال کو بھی اٹھایا ہے۔

3۔ مڈڈے میل:

حکومت نے ڈراپ آوٹ کو کم کرنے اور اسکول کے باہر رہنے والے بچوں کو اسکول کی طرف لانے کے لئے بہت سارے پروگرام بنائے۔ان میں کافی حد تک کامیاب پروگرام مڈڈے میل اسکیم ہے۔اس اسکیم کی کامیابی کے ساتھ بہت سارے نقصانات بھی ہوئے ہیں ان میں سے ایک چھوا چھوت ہے۔کئی جگہوں پر یہ دیکھا گیا کہ اونچی ذات کے طلبہ نچلی ذات کے طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانے سے کراہت محسوس کرنے لگے۔مثال کے طور پر 2015 میں Caring Citizens Collective (CCC) نے ایک رپورٹ تلنگانہ کی پیش کی جس میں کہا گیا کہ مڈ ڈے میل کی تیاری کے حوالے سے نلگنڈہ، میدک اور کھمم کے اسکولوں میں چھوا چھوت کا رویہ دیکھا گیا۔اونچی ذات کے طلبہ نے نچلی ذات سے تعلق رکھنے والے باورچی کے ہاتھوں بنا ہوا کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

(The Hindu, 2015, July 25)

2013 میں ایک پارلیمانی پینل نے مڈڈے میل کو لے کر رپورٹ پیش کی جس میں کہا گیا کہ اس تناظر میں 144 ضلعوں کی صورتحال بہت ہی ناساز ہے۔کئی جگہوں پر ذات پات کی بنیاد پر تعصب پایا گیا ہے۔

تتمہ: صدیوں سے ذات پات کے نظام نے ہندوستان کو مضبوطی سے جکڑا ہے۔اسکولی ماحول اسی سماج کا عکاس ہے۔جس میں گریڈڈ عدم مساوات کو دہرایا جاتا ہے۔امبیڈکر، پیریار سوامی، ساوتری بائی پھلے، جیوتی با پھلے، فاطمہ شیخ، بسونا جیسے مصلحین نے ذات پات جیسے مرض کو ختم کرنے کے لئے عظیم جدوجہد کی۔جس کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کے ہندوستانی دستور نے نچلی ذاتوں کو حقوق دیے۔لیکن آج بھی اسکول کی حالتوں پر نظر ڈالیں تو تعصب اور امتیازی رویہ نظر آتا ہے۔

اللہ تعالی فرماتا ہے ''یہ تو ہماری عنایت ہے کہ بنی آدم کو بزرگی (عزت) دی اور انہیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت (فضیلت) بخشی''۔(70:17 القرآن) اللہ نے جب اس مخلوق کو عزت بخشی ہو تو دوسرا انسان کون ہوتا ہے کہ اس کی عزت کو چھینے۔حکومتیں لاکھ قانون سازی کرے اس میں کوئی فرق نہیں آنے والا ہے۔ کیوں کہ اس قانون کا نفاذ ہی اگر متعصب شخص کرتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ یہ چیزیں ختم ہوں جائیں گی۔اس ناانصافی پر مبنی سماج کی اصلاح کے لئے ایک بڑی اور لمبی جدو دجہد درکار ہے۔ساتھ ساتھ فوری طور پر اسکولی سطح پر اس وبا کے خاتمے کے لئے ایک جدوجہد ہر اسکول کے SDMC میں شامل ہو کر اس کو چیک کرنے، رپورٹ کرنے، اسکول ٹیچرس اور دیگر اسٹاف جو بھی بھید بھاؤ کرتے ہوں ان پر سخت کاروائی یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔پرائمری اسکولی سطح سے ہی تعلیم اور اخلاقیات کے تناظر میں اس وبا کو بچوں کے دماغوں سے نکالنے کا کام مصلحین اور ذمہ دار و باشعور تنظیموں کی ذمہ داری ہے۔بچوں کو احساس دلایا جائے کہ بنی آدم کو خالق کائنات نے تکریم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

مصنف جے این یو، دہلی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔

حوالہ جات

- Deshpande, S., & Zacharias. (Eds.) (2013) U. Beyond Inclusion: The Practice of Equal Access in Indian Higher Education. New Delhi : Routledge, 2013.
- Guru, G., & Sarukkai, S. (2018). The cracked mirror: An Indian debate on experience and theory. Oxford University Press.
- Malish, C. M., & Ilavarasan, P. V. (2016). Higher education, reservation and scheduled castes: exploring institutional habitus of professional engineering colleges in Kerala. Higher Education.72 (5). (pp. 603-617). DOI: 10.1007/s10734-015-9966-7. India: Springer
- Nambissan, G. Geetha. (1996). Equity in Education? Schooling of Dalit Children in India. Economics and Political Weekly. Vol. 31
- Nambissan, G. Geetha, & Sedwal Mona (2002) Education for All: Situation of Dalit Children India. India Education Report

دہلی یونیورسٹی
میں ذات اور مذہب کے نام پر امتیاز
ایک مطالعہ

عفیف احمد

ڈی یو ہندوستان میں اعلیٰ درجے کی مرکزی یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ یہ اس کا غیر معمولی کٹ آف ہی ہے جو اسے ہندوستان کی سر فہرست تین یونیورسٹیوں میں جگہ دیتا ہے۔ ہر سال داخلے کے لیے یہاں بڑی تعداد میں درخواستیں آتی ہیں۔ مختلف شعبوں کے لیے پچھلے سال ۳/لاکھ سے زائد امیدوار ہوئے جب کہ یونیورسٹی میں کل سیٹیں تقریباً ۵۰۰۰۰ ہیں۔ سخت مسابقہ ہی ہے جو یہاں کی تعلیم کی عظمت کی عکاسی کرتا ہے۔ اتنے سخت مسابقہ کے باوجود مختلف ذات اور علاقوں کے طلبہ یہاں آنے میں کسی طرح کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کالجوں کو ثقافتی سنگم کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں مختلف تہذیبیں تو ہیں لیکن ان کے درمیان ہم آہنگی کا فقدان نظر آتا۔ کیوں کہ یہاں مختلف طرح کے امتیازات اور تعصّبات کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ کچھ سالوں سے خاص کر روہت ویمولا کی موت کے بعد ذات اور مذہب کے نام پر تعصّبات و امتیازات کے خلاف کالج کیمپس میں سنجیدہ مباحثوں کا آغاز ہوا ہے۔ حیدرآباد یونیورسٹی اور پانڈیچیری یونیورسٹی میں اس کے خلاف کوششیں زوروں پر ہیں۔ لیکن دہلی یونیورسٹی اس کے خلاف زبان کھولنے کو تیار نہیں ہے۔ کیا یہ خاموشی اس لیے ہے کہ دہلی یونیورسٹی میں امتیازات نہیں ہوتے اس لیے یہاں اس کی ضرورت نہیں؟ نہیں حقیقت یہ نہیں ہے۔ ڈی یو درحقیقت گھاس کی دبیز چادر میں چھپا ہوا ہرا سانپ ہے۔ یہاں اگرچہ ذاتی و مذہبی تعصّبات واضح نظر نہیں آتے ہیں لیکن یہ تعصّبات یہاں خوب پھل پھول رہے ہیں۔

آل انڈیا سروے آف ہایر ایجوکیشن کے مطابق ہندوستانی کالجز اور یونیورسٹیز کے تدریسی مناصب پر 2.58 فی صد ایسے افراد فائز ہیں جو ایس سی، ایس ٹی، او بی سی، پی ڈبلیو ڈی ہیں اور نہ ہی مذہبی اقلیتی والے۔ تو آخر ان پر کون قبضہ جمائے بیٹھے ہیں؟ برہمن، جی ہاں یہ برہمن اور ان کے حلیف طبقات ہیں۔ ہندوستان کے کل 496 وائس چانسلرس میں سے صرف 46 ان بیک ورڈ کلاسس سے ہیں جو کہ دس واں حصہ بھی نہیں ہے۔ دہلی یونیورسٹی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہاں کے تقریباً سارے کالجز میں اعلیٰ ذات والوں کا قبضہ جما ہوا ہے۔ اس حقیقت پر سے پردہ اٹھانے والا نیدھن سہانا کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو 2016 میں راؤنڈ ٹیبل انڈیا میں شائع ہوا تھا۔ اپنی تحقیق میں اس نے کوشش کی کہ مرانڈا کالج کے بورڈ ممبرز، پرنسپل، اکیڈمک اسٹاف اور اسٹوڈنٹ یونین ممبرز کی فہرست میں دلت، آدی باسی وغیرہ کا نام تلاش کرے۔ ان مناصب پر ان پچھڑی ذات والوں کا نام تک نہیں ملا۔ کیوں کہ ہر جگہ بڑی ذات والے قابض تھے۔ ہاں ایک جگہ تھی جہاں یہ پچھڑی ذات والے ملے اور یہ لسٹ ڈرائیور، چوکیدار، صفائی کرمچاری، حولدار اور دیگر نوکروں کی تھی۔ یہ صورت حال صرف مراندا کالج کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ دہلی یونیورسٹی کے سارے کالجز اسی رخ پر گامزن ہیں۔ اگر انتظامیہ کا حال یہ ہے تو سوچا جا سکتا ہے کہ پچھڑی ذاتوں کے متعلق طلبہ (بڑی ذات والے) کا رویہ اور برتاؤ کیسا ہوگا؟

طلبائی سیاست، الیکشن اور ذات پات:

دہلی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ یونین الیکشن کا ہمیشہ سے جنرل الیکشن سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ جنرل الیکشن کی طرح یہاں کے اسٹوڈنٹ یونین الیکشن میں شرکاء کی تعداد بڑی ہوتی ہے، بلکہ دونوں کے انتخابات میں اخراجات کے تناسب میں بھی بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جب بھی کوئی فریشر پہلی بار نارتھ کیمپس آتا ہے تو اس طرح کے بڑے بڑے بینر اور بورڈز کے ساتھ اس کا استقبال ہوتا ہے جس میں اس کے نام کے ساتھ اعلیٰ ذاتی علامتوں کو خوب نمایاں کیا جاتا ہے۔ اور اسٹوڈنٹ یونین الیکشن میں یہ طبقاتی نظام پوری طرح حاوی رہتا ہے۔ یہ صورت حال کسی پارٹی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ پارٹیاں اگرچہ نظریاتی طور پر ایک دوسرے سے بڑے اختلافات رکھتی ہیں، لیکن ہندوستانی طبقاتی نظام پر عمل کرنے میں یہ ساری پارٹیاں ایک پلیٹ فارم پر کھڑی نظر آتی ہیں۔

دہلی یونیورسٹی میں شمال مشرق کے طلبہ پر تشدد

جولائی ۲۰۱۵ء کی بات ہے مارتھا نامی طالب علم جس کا تعلق ناگا لینڈ سے تھا جو ہنس راج کالج میں زیر تعلیم تھا۔ اس کے ساتھ بڑی بدکلامی کی اور چینی کہہ کر علاقائی عصبیت کا ثبوت دیا۔ کچھ مہینوں بعد مارتھا نے اس شخص کو پہچان لیا جو کہ الیکشن کا ٹکٹ لیے تشہیری مہم چلا رہا تھا۔ دیواروں پر جا بجا اس شخص کی تصویریں لگی تھیں۔ کھمبے، ای رکشا، ہر کوئی اس شخص کا پرچار کر رہے تھا اور وہی وجے ناگر نامی شخص وہاں جہاں شمال مشرق کے اسٹوڈنٹس بڑی تعداد میں رہتے ہیں، جا کر کہتا ہے وہ شمال مشرقن (نارتھ ایسٹ) کی اٹھان اور ترقی کے لیے الیکشن لڑنا چاہتا ہے اور اس کو ان کی مدد چاہیے۔ مکاری اور نقالی کی بھی حد ہوتی ہے۔ شمال مشرق کے اسٹوڈنٹس کے خلاف تشدد بہت ہی عام ہے۔ ۲۹ رجنوری ۲۰۱۴ء کی بات ہے، جب ایک ۲۰ سالہ طالب علم نیڈو تانیا نسلی زیادتی کے سبب دماغی مرض کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ جس کے بعد پورے ملک میں بحث چھڑ جاتی ہے کہ آخر نارتھ ایسٹ کے طلبہ کے ساتھ کیوں اتنی عصبیت برتی جاتی ہے۔ یہ کہانی صرف نیڈو موت پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ آج بھی نارتھ ایسٹ کے طلبہ کے ساتھ یہاں طرح طرح کے امتیازات اور تعصّبات آسمان چھو رہے ہیں۔

حاصل کلام

ہمارے کالج میں ایک مذاکرہ رکھا گیا، جس میں شریک ممتاز سماجی کارکن بیزوادا ویلسن نے کہا کہ ہندوستان میں ہر جگہ ذات پات کا نظام اپنے قدم جمائے ہوئے ہے۔ کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں یہ طبقاتی نظام پکڑ نہ رکھتا ہو۔ تعلیمی اداروں میں تو اس کی جڑیں بہت ہی مضبوط ہیں۔ یہاں ساری سہولیات اسی کی بنا پر ملتی ہیں۔ برہمنوں کا قبضہ اس پر یوں ہے کہ پورے تعلیمی نظام کو برہمنی شکل دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑی تعداد ان طلبہ اور اساتذہ کی ہے جو تعلیم کے رخ کو سرے سے دوسری طرف موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جو کہ دہلی یونیورسٹی میں صاف نظر آتی ہے۔ اس لیے طلبائی سیاست میں ایک بڑے انقلاب کی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب یہ عظیم تعلیمی ادارے بالخصوص دہلی یونیورسٹی اپنی گہری دانش گاہی اور حقیقی روح سے محروم ہو جائے۔

مصنف دہلی یونیورسٹی کے طالب علم ہیں۔

نظر

منڈل کمیشن کے بعد تعلیمی اداروں کا جائزہ

تخلیق علم کے متبادل طریقوں کا ادراک

طاہر جمال کے ایم

عام طور پر یونیورسٹیز اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو انسانی سماج، بلکہ ملک کا آئینہ تصور کیا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں اور طلبہ کے عزائم کو اسی بنیاد پر جانچا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہی مستقبل کی نسل کے معمار ہیں۔ لیکن تعلیمی ادارے کی وہ قسم جسے ملک کے سماج کی نمائندگی کرنے کا حق حاصل ہے، صرف مخصوص قسم کے نوجوانوں کے عزائم ہی کا علمبردار ہوتی ہے اور عام طور پر ملک میں تعصب و امتیاز پر مبنی چودھراہٹ پر تنقید کرنے سے ہچکچاتی ہے۔ منڈل کمیشن کے بعد دلت اور مسلم طبقوں میں آئی بیداری نے ہماری یونیورسٹیز کو ان طبقوں کے طلبہ کو بھی تعلیم کے پروسیس میں شامل کرنے پر مجبور کر دیا جنہیں کبھی حاشیہ پر رکھا جاتا تھا۔ گزشتہ دو دہائیوں کے دوران یونیورسٹیز میں ان طبقات کے سیاسی و سماجی عزائم بالکل عیاں ہیں۔ تعلیمی اداروں میں ہونے والے خودکشی کے حادثات اور ڈراپ آؤٹس کے مسائل کو، جن کی مثالیں نام نہاد اعلیٰ یونیورسٹیز کے ورثے میں نہیں پائی جاتیں، اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ ہماری اشرافیہ کی شاندار یونیورسٹیز برسوں کی شاندار روایت رکھتی ہوں گی، لیکن ان اداروں میں دلت-مسلم طلبہ کی قابل ذکر موجودگی محض چند سال ہی پرانی ہے۔

ریاست کے دوسرے اداروں کی طرح اب تک یہ مقدس تعلیمی ادارے بھی منافرت پھیلانے والے افراد کی موجودگی سے پاک تھے۔ منڈل اور بابری کے دو دہائیوں کے بعد بھی ہندوستان کا دانشور طبقہ جامعیت اور تنوع کا محض مصنوعی دعویٰ ہی کرتا ہے۔ نو جمہوری تحریکات سے متعلق سوالات اور شناخت کی بنیاد پر امتیاز بھی پیچھے نہیں چھوڑا گیا۔ کیا مسلم-دلت-پسماندہ طبقات کو مقدس سیکولر اداروں میں اپنے احساسات پیش کرنے کی اجازت دی جانی چاہئے؟ معروف خیال یہ تھا کہ ”ان طبقات کو مخصوص ذات برادری کے لئے مختص اداروں کے تقدس اور حسن و جوہر کو پامال کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دینی چاہئے۔“ (گویا اعلیٰ ذات کا ٹیگ

عوامی شعبہ جات میں ایک عام بات ہے)۔ان مباحث کا ماحصل تعلیمی اداروں میں طلبہ کو انتہا پسندی سے محفوظ رکھنے کی تجاویز کی شکل میں سامنے آیا۔وزیر اعظم نے ستمبر 2011 میں منعقدہ نیشنل انٹیگریشن کاؤنسل (NIC) کی میٹنگ میں کہا کہ ''ہمارے بعض نوجوانوں کی انتہا پسندی کے اسباب کو پہچاننے اوران سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔ واضح طور پر ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ملازمت اور روزگار کے سیر حاصل مواقع کی کمی اس قسم کی انتہا پسندی کے پیچھے ایک اہم سبب ہے۔اس مسئلہ کو حل کرنے میں تعلیم اور صلاحیتوں کے ارتقاء کو کلیدی رول ادا کرنا ہے۔'' تب این آئی سی نے تعلیمی اداروں میں لانچ کرنے کے لئے مؤثر پروگرام پیش کئے تھے۔جس کا مقصد اکیڈمک خطرات کا قلع قمع کرنا تھا۔ان کے نزدیک اس مسئلے کی بنیاد نوجوان مرد وخواتین کے لئے بقدر ضرورت روزگار کی عدم موجودگی تھی۔ ان کے مطابق اس مسئلے کے حل کے لئے تعلیم اور صلاحیتوں کے ارتقاء کو کلیدی رول ادا کرنا تھا۔مسئلے کے اس حل کا تعلق اقلیتی طبقات کو مہذب بنانے اور انہیں مین اسٹریم میں لانے کی برہمن طبقے کی ٹھیکیداری سے ہے۔

اعلی تعلیمی اداروں میں دلت طلبہ کی معتد بہ تعداد کے خودکشی کرنے کی حالیہ اطلاعات کے ذریعے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔''نصاب کی تیاری سے لے کر کلاس روم کے اسٹرکچر تک ذات پات کا نظام مختلف رول ادا کرتا ہے۔مثال کے طور پر کالی کٹ یونیورسٹی میں بی اے انگریزی کی کتاب، انڈین بلوسمس (Indian Blossoms) میں دس مختلف تخلیق کاروں کی نظمیں اور کہانیاں شامل ہیں۔ان دس میں سے چھ کا تعلق برہمن خاندانوں سے ہے۔(بلا شبہ انڈین بلوسمس دراصل برہمن بلاسمس ہے!)۔ پسماندہ طبقات کے طلبہ کی اکیڈمک توہین ہم-طبقہ طلبہ کی کمی اور نصاب اور کتاب میں ان کے دانشوروں کی نمائندگی کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مابعد منڈل کمیشن تعلیمی صورتحال کی بحث میں اس کمی کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے، جو کہ پسماندہ طلبہ کی تکلیف میں اضافہ کا باعث ہے۔بلا شبہ ایک استاد اور طالب علم کے درمیان ہونے والی گفتگو میں ذات، مذہب اور علاقہ کا اب بھی غلبہ ہے۔ اجتماعی شعبوں میں ان شناختوں کے ظاہر ہوتے ہی تعصب و امتیاز کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔یونیورسٹیز میں اسکالرشپ طلبہ کے لئے ایک ایسا ٹیگ بن جاتی ہے۔جس کی بنیاد پر لوگ انہیں ناقص یا نااہل تصور کرنے لگتے ہیں۔کسی طبقے کی ظاہری علامات مثلاً مسلم نام یا حجاب و برقعہ وغیرہ کو اکثر تعلیمی تفوق کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے۔تعلیمی تفوق کی دوڑ میں ان طبقات کو نظر انداز کردیا جائے گا اور اس کا ذمہ دار اس طبقے کے مسائل کو قرار دیا جائے گا۔ان طبقات کے مسائل کا محض تجزیہ کرتے رہنے کی بجائے تعلیمی میدان میں ان طبقات کو قبول کرنے کے سلسلے میں امتیازی رویے پر گفتگو کرنی ہوگی۔ایک کشمیری طالب علم ہمارے ملک کی سالمیت کے لئے بڑا خطرہ ہے۔اسے ہمیشہ ایک غصہ دلانے والے مفت خور کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اعلی طبقوں کے طلبہ کے نام میں نمایاں طور پر موجود مختلف ذاتوں کو جمہوری سیکولر فضا کے لئے کبھی خطرہ نہیں باور کیا جاتا ہے۔لیکن کسی دلت کی جانب سے محض غالب ذاتوں کے خلاف مزاحمت کی علامت کے طور پر اس کی ذات پر اصرار کو عوامی تحفظ کے لئے ایک بڑے خطرے کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور ان کی جماعت کو مستقل وبائی اندیشہ مانا جاتا ہے۔ان کا وجود جدیدیت کی راہ کا روڑا تصور کیا جاتا ہے۔ملک کا دانشور طبقہ بھی پسماندہ طلبہ کی نااہلی کا حل یہی بتائے گا کہ دقیانوسی طور طریقے رکھنے والی کمیونٹی پر اصرار کی بجائے وہ خود کو ملک کی سالمیت کے معروف بیانئے کے ساتھ ہم آہنگ کرلیں۔ رہے وہ لوگ جو کلچر اور ثقافت کی اس اجارہ داری کے خلاف مزاحمت کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو انہیں بنیاد پرست، دہشت گرد یا پھر ماؤنواز قرار دیا جائے گا۔پسماندہ طبقوں کے طلبہ اگر اپنا ذاتی کمرہ تلاش کر کے اسی میں رہیں اور مین اسٹریم طلبہ تنظیموں مثلاً ایس ایف آئی یا اے بی وی پی کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنا تعلیمی سفر جاری رکھیں تو کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔لیکن جیسے ہی وہ اپنی شناخت بطور مسلم، پسماندہ یا دلت ظاہر کرتے ہیں اور اپنی خود کی اجتماعیت تشکیل دیتے ہیں، منظر نامہ یکا یک تبدیل ہوجاتا ہے۔ان کی اجتماعیت لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ طلبہ سے گفت وشنید کی زحمت گوارا کیے بغیر ایڈمنسٹریشن پولس کو بلا لائے گا۔ ان طلبہ کے سوالوں کا جواب دینے سے ایڈمنسٹریشن ڈرتا ہے اس لئے پولس کو بلالاتا ہے تاکہ پولس جواب دے۔

بھارت میں سیکولر جمہوری فریم ورک میں نیشن اسٹیٹ کا تصور ہمیشہ پہلے سے طاقتور طبقہ کو مزید طاقتور بناتا ہے۔تعلیمی اداروں میں ہندتوا کے جابرانہ اور متشدد دعوؤں کو بالکل نارمل بات سمجھی جاتی ہے جب کہ پسماندہ طبقات کی جانب سے حصول انصاف کے لئے لگائے جانے والے کسی نعرے پر، کسی بھی تحریک اور جدوجہد پر غیر سیکولر، بنیاد پرستی، دہشت گردی، علاحدگی پسندی اور وطن سے غداری کا سستا بھونڈا الزام عائد کردیا جاتا ہے۔ چنانچہ پسماندہ طبقات کے مطالبات کو قومی سالمیت کے لئے خطرناک ثابت کردیا جاتا ہے۔ پھر اعلی ذات پر مشتمل غالب طبقہ قومی مفاد کا ٹھیکہ لے کر سامنے آجاتا ہے۔ اس صورتحال سے تعلیمی ادارے بھی بچے ہوئے نہیں ہیں۔طلبہ برادری کے مسائل اعلی ذات کی طلبہ برادری کے مسائل کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔سودھا ک ف لکھتی ہیں: ''کس بات کو 'طلبہ کا مسئلہ' کہا جاسکتا ہے اور کس بات کو نہیں، اس کا تعین بھی ذات پات کے اسی تعصب کے معیار پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر EFLU جیسے مؤقر ادارے میں کسی طالب علم کو داخلہ دیا جاتا ہے یا داخلہ رد کردیا جاتا ہے۔''اب تک حاشیے پر رکھے گئے دلت-مسلم سماج کے ان طلبہ کے ذریعے تعلیمی اداروں میں اٹھائے گئے بنیادی سوالات نے سوالات کے اس روایتی شاکلے کو توڑ دیا ہے جن میں دایاں محاذ یا بایاں محاذ مرکوز گفتگو ہوتی تھی۔اگر دائیں محاذ نے جس کے سر پر ہندتوا سیاست کا ہاتھ ہے، ان سوالات کا جواب تشدد سے دیا ہے تو بائیں محاذ نے انہیں غیر سیاسی، فرقہ پرستانہ اور انتہا پسندانہ قرار دیا ہے۔ جب ان سوالات نے ایک منظم عملی تحریک کا روپ دھارلیا تب خود بائیں محاذ نے بھی اس کا جواب تشدد ہی سے دیا۔ایس ایف آئی کے اوباشوں کے ذریعے حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی میں امبیڈکر اسٹوڈنٹس اسوسی ایشن اور بہوجن اسٹوڈنٹس فرنٹ کے وابستگان کو مسلسل زدوکوب کیا جانا، اور کیرالا کے تعلیمی

اداروں میں ایس ایف آئی ہی کے ذریعے ایس آئی او کے طلبہ کو جسمانی اذیت پہنچانا اس کی محض چند مثالیں ہیں۔ پسماندہ طبقات کی یہ تحریک اعلی ذات کے طلبہ کی تحریکات کی طرح محض نام نہاد تحریک بطور فیشن نہیں تھی بلکہ ان کی تحریک ان کے عین وجود کی لڑائی لڑنے کے لئے تھی جس میں ان کی زندگی کے سچے تلخ تجربات بھی شامل تھے۔ دانشورانہ اکیڈمک سرگرمیوں سے دانشورانہ سیاسی تجربے تک کے اس سفر نے دانشور طبقے میں سیکھنے اور تخلیق علم کے روایتی طور طریقوں کی بھی تشکیلِ نو کردی۔ ان کی ان اعلی اکیڈمک جدوجہد میں مداخلت نے قوت کے ان مراکز تک رسائی حاصل کرنے کے عزم سے تحریک حاصل کی ہے جن سے اب تک انہیں محروم رکھا گیا تھا۔ اگر ہم مختلف نسلوں میں خواندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ یہ دلت اور مسلم کی اپنے خاندان، طبقہ یا علاقہ سے پہلی نسل ہے جو اعلی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ جب کہ اعلی ذات والوں کی یہ تیسری اور چوتھی نسل ہے جو اعلی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ یہ حقیقت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ تعلیم کے محاذ پر اقلیتی طبقات پر کتنی زیادہ خصوصی توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں جنس اور صنف کا مسئلہ بہت زیادہ اہم نہیں ہے۔ اس لئے کہ اَپر کاسٹ سے تعلق رکھنے والی طالبات اعلی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اگر چہ کہ وہ اپر کاسٹ مردوں سے ایک نسل پیچھے ہیں لیکن پسماندہ طبقات کے طلبہ سے دو نسل آگے ہیں۔

ایک طرح سے مسلم طلبہ کا وجود ایک غلط سانحے، انہدام بابری مسجد کا مثبت اثر ہے۔ اس طرح اس نو حاصل شدہ شعور کے ذریعے وہ برہمن اجارہ داری اور طاقتوں کے لئے ایک مخصوص چیلنج ثابت ہو رہے ہیں۔ اور وہ ایسا کرنے میں محض اپنے اس نام اور اس شناخت کے ذریعے کامیاب ہو رہے ہیں جس نام وشناخت کی بنیاد پر نام نہاد اشرافیہ کے حلقے میں ان کی آواز کو خاموش کر دیا جاتا تھا۔

کسی تعلیمی ادارے میں ایک مسلم ہونا، ایک دلت یا ایک خاتون ہونے سے زیادہ مشکل ہے۔ مسلم طلبہ کی ایسی اجتماعیت جو اپنے آپ کو کسی سیکولر دائیں یا بائیں محاذ سے نہیں جوڑتی، قومی سلامتی کے لئے ایک بڑا خطرہ باور کی جاتی ہے۔ حیدرآباد مرکزی یونیورسٹی میں ایک کشمیری طالب علم نے اس پر روشنی ڈالی ہے کہ امبیڈکر اسوسی ایشن میں مسلم وقار اور مسلم ثقافت پر گفتگو کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ مزید یہ کہ ایڈمنسٹریشن اور ریاست کے ضابطے اور پیمانے مسلم طلبہ کے لئے زیادہ سخت ہیں جنہیں اپنی حب الوطنی کا مستقل ثبوت دیتے رہنا پڑتا ہے۔

پروپگنڈہ پر مبنی لو جہاد کی مہم نے کیمپس میں غیر مسلم طالبات کی مسلم طلبہ سے دوستی پر منفی اثرات ڈالے۔ مسلمانوں کے سلسلے میں پہلے سے موجود تنگ خیالی کہ مسلمان جنسی معاملے میں بدنام ہوتے ہیں، میں اضافہ کرتے ہوئے لو جہاد کی مہم جس کا آغاز ملیالم منورما جیسے مین اسٹریم اخبار نے کیا تھا، دوستانہ تعلقات اور بین المذاہب رومانس کو ایک نئی مشتبہ شکل دے دی۔ مسلم طلبہ نے بایاں محاذ طلبائی پارٹی کی سیکولر پناہ گاہوں کو خود کو منظم کرنے کی بجائے اپنی سیکولر ساکھ کو بحال کرتے اور غیر مسلم لڑکیوں سے دوستی کرتے ہوئے پایا۔ دوسری طرف اس نے مسلم طلبہ کو سیکیولر فریم ورک کے عام ماڈل کو ختم کرنے پر ابھارا۔ مجھے خود ذاتی طور پر ہفتہ عاشورہ اور بیف فیسٹ میں شرکت کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ بقول منتظمین، میری موجودگی معاملے کو "مذہبی" رخ دے دے گی۔ میرے محض جسمانی وجود سے ہونے والی اس "مذہبی منافرت" نے اپنی شناخت کے سلسلے میں ایک نیا شعور عطا کیا جو کہ نیشنل فریم ورک سے مختلف ہے۔ انور عبداللہ کے افسانچے علی گڑھی لے پشو (علی گڑھ میں گائے) کو مذہبی منافرت پھیلانے کی اس مشینری سے جوڑا جاسکتا ہے جس کا انتظام سیکولر زعفرانیوں نے کر رکھا ہے۔ ہندتوا کے تند و تیز پروپگنڈوں پر بند باندھنے کے لئے مسلم طلبہ کے لئے مناسب ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو دلتوں اور دوسرے غیر مسلم پسماندہ طبقات کے ساتھ جوڑیں۔ یہ نام نہاد سیکولر خطرہ بہت سے مسلم طلبہ اور مسلم تنظیموں کو سیاسی مداخلت سے محروم رکھتا ہے اور انہیں اپنی ساری توانائیاں خالص مذہبی دائرہ کار کی نذر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

مصنف حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔

نظر

ہائیر ایجوکیشن کمیشن بل

شارق انصر

ریفارم یا تعلیمی اداروں میں قبضہ کی کوشش

مرکزی حکومت اپنے اقتدار کے چار سال مکمل کر چکی ہے اور اب اقتدار کے آخری مرحلے میں ہے۔ تعلیمی ریفارم کے نام پر مودی حکومت نے کوئی ٹھوس کام اب تک نہیں کیا۔ نئی تعلیمی پالیسی کو لے کر مرکزی حکومت کوئی قابلِ ذکر پیش رفت کرنے میں ناکام ہے اور جس کے نتیجے میں مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل اسمرتی ایرانی کو محکمہ سے ہٹا کر پرکاش جاوڈیکر کو نیا وزیر بنا دیا گیا۔ پرکاش جاوڈیکر نے بھی تعلیمی میدان میں کچھ خاص کارنامہ انجام نہیں دیا جس کے نتیجے میں اب جلد بازی کرتے ہوئے اب حکومت ریفارم کے نام پر الٹے سیدھے فیصلے لے رہی ہے۔

مرکزی حکومت کے ذریعے ۲۷ جون ۲۰۱۸ء کو اعلیٰ تعلیم سے متعلق ایک ڈرافٹ منظر عام پر آیا جس کا نام ہائیر ایجوکیشن کمیشن بل ہے۔ جس کے مدنظر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کو ختم کرنا ہے یعنی پارلیمنٹ ایکٹ کے تحت بنے UGC Act 1956 کو ختم کر کے HECI-18 بل کو لاگو کرنا ہے۔ دراصل اس سے پہلے بھی شیپال کمیٹی، نیشنل نالج کمیشن اور ہری گوتم کمیٹی نے بھی یو جی سی کو ختم کرنے کی سفارش کی تھی۔ لیکن حکومت نے جس انداز سے اور جلد بازی میں اس کا مسودہ پیش کیا اس سے اس کی غیر سنجیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو مودی حکومت کے کئی سابقہ فیصلوں میں بھی نظر آتی ہے۔

۲۷ جون ۲۰۱۸ء کو اس بل کی تفصیلات کو عوام کے درمیان لایا گیا اور محض ۱۰ دن کے اندر یعنی ۷ جولائی تک عوام سے رائے مانگی گئی۔ حکومت کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کے اتنے بڑے فیصلے کے لیے عوام سے رائے طلب کرنے کے نام پر صرف خانہ پری کی کوشش کی گئی۔ بعد میں جب اس پر نکتہ چینی شروع ہوئی تو اسے بڑھا کر ۲۰ جولائی تک کر دیا گیا۔ اس بل کے خلاف ماہرین تعلیم نے سخت حیرانی اور غصہ کا اظہار کیا اور اسے بنا ٹھوس تیاری، بغیر رائے مشورے اور جلد بازی میں لیا گیا فیصلہ قرار دیا۔ دوسری جانب بل میں جو باتیں کہی گئی ہیں اس سے اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ حکومت اس کے ذریعہ تعلیمی اداروں پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتی ہے اور انتہائی محدود اختیارات رکھنے والا ایک کمیشن بنا کر چور دروازے سے تعلیمی اداروں کے انتظام و انصرام پر قابض ہونا چاہتی ہے۔ جس میں تجویز کیا گیا ہے کہ تعلیمی اداروں کو دیے جانے والے بجٹ، گرانٹس وغیرہ کا فیصلہ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل اور حکومت ہند کرے گی جبکہ کمیشن صرف تعلیم سے جڑے معاملوں پر نظر رکھے گا۔ کمیشن کو تعلیمی سرگرمیوں کی انجام دہی کی اجازت ہوگی ساتھ ہی قانون کی خلاف ورزی کرنے والے تعلیمی اداروں کو ملنے والے گرانٹس اور الحاق کو ختم کرنے کی سفارش کا حق بھی حاصل ہوگا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت تعلیمی اداروں پر جبراً مسلط ہونا چاہتی ہے اور خوف و ہراس پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تعلیمی سرگرمیوں کو انجام دلانے کی حکومتی کوشش سے تعلیمی اداروں کی خودمختاری پر ضرب لگے گی جس سے ان اداروں کی آزادی چھن جانے کا خطرہ یقینی ہو جائے گا۔ جس کے نتیجے میں بے خوف ہو کر تعلیمی اداروں کا تعلیمی سرگرمیاں انجام دینا مشکل تر ہوگا۔ حکومت کے بجٹ، گرانٹس اور پیسوں سے متعلق ایماندارانہ فیصلہ پر بھی سوالیہ نشان ہے۔ اس سے تعلیم کا معیار متاثر ہوگا اور حکومت اپنی مرضی کے مطابق تعلیمی اداروں پر اثر انداز ہو سکے گی۔

اس مجوزہ بل میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلبہ کے مفاد کی خلاف ورزی کرنے والے اور تعلیمی اداروں کے ذریعے معیار میں تخفیف کرنے کی صورت میں کمیشن تعلیمی اداروں کو بند کرنے کی بھی سفارش کر سکتا ہے۔ مزید یہ کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کمیشن ہی نصاب طے کرے گا اور یہ بھی طے کرے گا کہ طلبہ کیا سیکھیں گے اور کیا نہیں سیکھیں گے۔ اس سے نہ صرف طلبہ کی تخلیقی صلاحیت کو نقصان پہنچے گا، بلکہ تعلیمی اداروں میں آزادی، ریسرچ اور نالج کلچر پر بھی زبردست ضرب لگے گی۔ ہندوستان میں ہر تعلیمی ادارے کی الگ پہچان اور منفرد معیار ہے سب کو ایک ہی رنگ میں رنگنے کی یہ کوشش ہمارے اعلیٰ تعلیم کی خودمختاری اور انفرادیت کو زبردست نقصان پہنچا سکتی ہے۔

ہائیر ایجوکیشن کمیشن بل پر ایک نظر:

- بل میں تجویز کیے گئے مرکزیت کے خیال سے ملک کی تکثیریت، جمہوری قدروں اور اظہار رائے کی آزادی پر گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔
- پیش کش اور کامیابی پر منحصر فنڈنگ کا نظام پسماندہ سماج سے آنے والے طلباء کو متاثر کرے گا۔
- مجوزہ قانون اعلیٰ تعلیم کے اصل مقصد علم کے حصول اور تخلیق کے عمل سے زیادہ input اور output کے عمل پر زور دیتا ہے، جو تعلیم کے فلسفہ کے مخالف ہے۔
- اس بل میں مجوزہ کئی شرائط ملک کی ریزرویشن پالیسی اور سماجی عدل کے خلاف ہیں۔
- مجوزہ قانون، کمیشن کے چیئرمین، وائس چیئرمین اور ۱۲ افسروں کی تقرری کے مکمل اختیارات مرکزی حکومت کو دیتا ہے۔ اس میں مرکزی حکومت کے ۲ نمائندے بھی ہوں گے۔ حکومت ملک سے باہر رہنے والے شخص کو بھی چیئرمین بنا سکتی ہے جس پر لوگوں نے سخت احتجاج کیا ہے۔

● تقرر کے لیے بنائی گئی کمیٹی تعلیمی لحاظ سے کمیشن کے چیئرمین، وائس چیئرمین کے تقرر کی اہل نہیں ہے۔
● مرکز کے دو نمائندے کابینہ سکریٹری اور ایجوکیشن سکریٹری کا کمیٹی میں ممبر کی حیثیت سے رہنا، سبھی فیصلوں پر حکومت کے اثر انداز ہونے کا خطرہ پیدا کرے گا۔
● مخصوص نظریہ کے ماننے والے سیاسی پارٹی کے حامل لوگوں کو فیصلہ ساز عہدوں پر مقرر کیا جائے گا تا کہ ایک مخصوص نظریہ کی اشاعت کی جا سکے۔
● کمیشن کی پوری تشکیل اور ڈھانچہ اس طرح کا ہے، جس پر ہمیشہ مرکزی حکومت غالب رہے گی۔
● کارپوریٹ میدان سے ایک شخص کا بحیثیت ممبر تقرر مرکزی حکومت کے مارکیٹ اور کارپوریٹ ایجنڈے کو صاف ظاہر کرتا ہے۔
● کمیشن میں صرف ۲/۱ اساتذہ ہوں گے جب کہ یو جی سی میں کم سے کم ۴/۱ اساتذہ کے ہونے کی بات کہی گئی ہے۔
● کمیشن کو صرف حکومت کو صلاح دینے کی طاقت ہوگی، اعلیٰ تعلیم کے لیے فیس طے کرنے کے طریقے اور معیار طے کرنے کا کام کمیشن کرے گا اور حکومت کو صلاح دے گا۔
● تعلیمی اداروں میں ڈونیشن کلچر پر روک لگانے کے تعلق سے UGC Act 1956 میں تفصیلی بات کہی گئی ہے لیکن اس بل میں صرف صلاح دینے کی حد تک ہی اسے محدود کر دیا گیا ہے۔
● مجوزہ بل میں کمیشن تعلیمی اداروں کی تدریسی و تعلیمی سرگرمیوں کا سالانہ ڈاٹا بیس تیار کرے گا اور اس کی رینکنگ کرے گا، لیکن اسے عملی طور پر انجام دینا مشکل ہے۔ اس وقت ملک میں ۷۸۹ یونیورسٹیز اور ہزاروں کی تعداد میں کالجز موجود ہیں۔ ان تمام کا یکساں ڈاٹا بیس تیار کرنا اور اس کا سالانہ جائزہ لینا آسان کام نہیں ہے۔
● غیر جانبدارانہ طور پر جائزہ لینا جہاں مشکل ہے وہیں میٹرو، شہروں، قصبوں اور گاؤں کے تعلیمی اداروں کے بیچ فاصلہ بڑھنے کا خطرہ ہے۔
● مجوزہ بل میں سب سے پریشانی کی بات اقلیتی تعلیمی اداروں کے لیے ہوگی جو سب سے زیادہ حکومت کے نشانے پر ہیں اور حکومت من مانے طریقے سے اس کا فائدہ اٹھائے گی۔

یو جی سی کے قیام کا مقصد اور مجوزہ بل کی حکومتی کوشش:

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام ۱۹۵۶ء میں پارلیمنٹ ایکٹ کے تحت کیا گیا تھا۔ اس کے قیام کا مقصد اعلیٰ تعلیم کے معیار کو بہتر کرنا، اس کی مانیٹرنگ اور دیکھ بھال کرنا تھا۔ یہ کمیشن اعلیٰ تعلیمی اداروں کے لیے گرانٹس کی فراہمی، معیار کی جانچ اور اس کی رینکنگ بھی کرتا ہے۔ فرضی اعلیٰ تعلیمی اداروں کی فہرست بھی وقتاً فوقتاً جاری کرتا ہے۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۸-۴۹ء میں مشہور ماہر تعلیم ایس رادھا کرشنن کی قیادت میں اس کے قیام کی کوششوں کا آغاز ہوا اور ملک کی ضرورت کے پیش نظر اعلیٰ تعلیم کے معیار اور مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کا قیام عمل میں آیا۔ ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھوں ۲۸ دسمبر ۱۹۵۳ء میں اس کی سنگ بنیاد رکھی گئی اور ۱۹۵۶ء میں پارلیمنٹ ایکٹ ۱۹۵۶ء کے تحت University Grants Commission Act 1956 عمل میں آیا۔ پچھلے ۷۰ سالوں سے یو جی سی اعلیٰ تعلیمی اداروں کے معیار کو بلند کرنے اور بہتر تعلیمی انفراسٹرکچر فراہم کرنے میں سرگرداں ہے۔ اسے ختم کرنے کی سفارشیں پچھلے کئی کمیٹیوں نے دی ہیں، لیکن اس کے بدلے میں اعلیٰ تعلیم کی مانیٹرنگ، معیار، رینکنگ اور دیگر معاملات کا انتظام وانصرام کیسے ہوگا اس پر کوئی ٹھوس حکمت عملی کا خاکہ نہیں پیش کیا گیا۔ یو پی اے کے دورِ حکومت میں Resource National Council for Higher Education (NCHER) بنانے کی بات کہی گئی تھی۔ لیکن حکومت اس تعلق سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ UGC کو ختم کر کے نئے کمیشن پر جو دلیلیں دی جا رہی ہیں اس پر بھی اب تک کوئی ٹھوس شکل پیش نہیں کی جا سکی۔ کہا گیا کہ یو جی سی تعلیمی معیار اور ریسرچ کو بہتر بنانے میں ناکام رہی ہے۔ اور یو جی سی کی بیوروکریسی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم میں مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ گرانٹس دینے اور رینکنگ کے سلسلے میں کئی خرابیاں پائی گئی ہیں۔ حکومت اب نئے حالات میں اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کا ایک معیار طے کرے گی وغیرہ۔

دراصل ان سب مسائل کا حل یعنی مجوزہ بل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت جلد بازی میں کچھ نیا کرنے کی کوشش میں اعلیٰ تعلیم کا بیڑا غرق کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جس طرح پلاننگ کمیشن کا نام تبدیل کر کے اُسے نیتی آیوگ بنایا گیا اور حکومت اس میں ناکام رہی اس بات کا اندیشہ حکومت کے اس فیصلے سے بھی ہوتا ہے۔ مرکزی حکومت پچھلے ۴ سالوں میں تعلیم کے معیار کے ساتھ کھلواڑ کرتی رہی ہے۔ بجٹ میں کمی کی گئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالرشپ اور فنڈ کٹ کیا گیا۔ تعلیم کے زعفرانی کرن کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ چار سال میں نئی تعلیمی پالیسی کے نام پر بھی کوئی ٹھوس چیز نہیں لا سکی ہے جس سے حکومت پر دباؤ ہے۔ اور وہ اسی دباؤ کے تحت جلد بازی میں اسے پیش کر اپنی پیٹھ تھپتھپانا چاہتی ہے۔ ۱۳/ اگست ۲۰۱۵ء میں مشہور ماہر تعلیم اور نوبل انعام یافتہ امرتیہ سین نے کہا تھا کہ مودی حکومت میں تعلیمی اداروں کی اکیڈمک خود مختاری کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ حکومت اب اپنے ایجنڈے سے اس بات کو ثابت کر رہی ہے۔

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا نظام دنیا میں تیسرا سب سے بڑا نظام ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۲۰۱۴ء تک ہندوستان میں یونیورسٹیز کی تعداد ۳۴ گنا بڑھی ہے۔ اس وقت ملک میں تقریباً ۸۰۰ یونیورسٹیز اور ۴۰ ہزار کے آس پاس کالجز ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں تعلیمی ادارے ہونے کے باوجود ان میں تعلیمی معیار کا فقدان نظر آتا ہے۔ ملک میں بیرونی تعلیمی اداروں کی شاخ قائم کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ موجودہ حکومت بھی یہ کام کر رہی ہے لیکن ملک کے تعلیمی اداروں کو عالمی رینکنگ کے برابر لانے کی کوششیں زیادہ منظم طریقے سے نہیں ہو پائی ہیں۔ حکومت صرف چنندہ اعلیٰ تعلیمی اداروں پر فوکس کرتی ہے جبکہ سیکڑوں اعلیٰ تعلیمی ادارے بری حالت میں ہیں۔ ان تعلیمی اداروں میں ملک کی بڑی آبادی پڑھتی ہے۔ اگر ان کے فنڈ انفراسٹرکچر، ٹیچرس اور دیگر ضروریات کو پورا کر دیا جائے تو ملک میں اعلیٰ تعلیم کا معیار خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

مصنف فریٹرنٹی موومنٹ کے جنرل سکریٹری ہیں۔

نصابِ تعلیم اور سماجی عدم مساوات

| کرشن کمار

اسکول، کالجس اور تعلیمی اداروں کا ذات پات کی بحث سے کنارہ کش رہنا اس امید کو جھوٹا ثابت کردے گا کہ تعلیم کے ذریعہ سماجی عدم مساوات کا خاتمہ ہوگا۔

ہندوستان جدید ٹیکنالوجی اور شہری رنگارنگی سے آراستہ ایک ملک ضرور بن گیا ہے لیکن ذات پات جیسا قدیم اور فرسودہ نظام اب بھی ہمارے سماج اور سیاست پر اثر انداز ہے۔ مہاراشٹرا میں رونما ہوا حالیہ واقعہ بتاتا ہے کہ ان قدیم موضوعات پر بحث و مباحثہ اب بھی نہایت ضروری ہے۔

تین دلت نوجوانوں کو بے دردی سے پیٹا گیا اور سرِ عام برہنہ گھمایا گیا۔ ان نوجوانوں کا جرم بس اتنا تھا کہ انہوں نے اس کنویں پر نہانے کی جرأت کی تھی جہاں پسماندہ طبقے کی رسائی ممنوع تھی۔ مظلوم طبقے کے خلاف اس پوری واردات کو انجام دینے والوں نے خود ہی اسے لوگوں کے سامنے پیش بھی کیا۔ اس کے ذریعے شاید وہ یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ اعلیٰ طبقہ کی بنائی ہوئی خود ساختہ روایات کو توڑنے کا یہی انجام ہوگا۔ ان کو اس سے مطلب نہیں ہے کہ زمانہ بدل چکا ہے اور تاریخ اپنی فرسودہ روایات کو پیچھے چھوڑ کر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ موجودہ سیاست میں کچھ تو ایسی بات ضرور ہے کہ ایسے لوگوں کو اب بھی اس طرح کی ظالمانہ روایات کو برقرار رکھنے کا موقع ملا ہوا ہے۔

یہ پورا واقعہ مجھے ہندوستان کے اس قدیم دور کی یاد دلاتا ہے جب کنوؤں کے ذریعہ پانی حاصل کیا جاتا تھا۔ پائپ لائن کا کوئی رواج نہ تھا اور کنویں بھی ذات پات کی سرحدوں میں تقسیم تھے۔ اپنے گھر کے احاطے میں خود کا کنواں ہونا اکرام کی بات سمجھی جاتی تھی۔ منشی پریم چند نے کئی مختصر کہانیاں کنوؤں اور اس سے متعلق جھگڑوں کو ہی موضوع بنا کر لکھی ہیں۔ انہیں میں سے ایک کہانی ''ٹھاکر کا کنواں'' ہے جو غالباً 1930 میں لکھی گئی تھی۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک شودر مزدور کی بیوی اپنے بیمار شوہر کی پیاس بجھانے کے لئے رات کے اندھیرے میں چھپ چھپا کر پانی لینے کی جرأت کرتی ہے۔ جس کنویں سے شودر پانی پیتے تھے اس میں کسی جانور کے گر جانے سے بدبو پھیل گئی تھی۔ رات کے اس پہر

ٹھاکر کا کنواں ہی ایک واحد آسرا تھا۔ ابھی وہ پانی بھرنے ہی والی ہوتی ہے کہ ٹھاکر کا دروازہ کھلتا ہے۔ پکڑے جانے کے خوف سے وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ گھر پہنچتی ہے تو دیکھتی ہے کہ اس کا شوہر وہی گندے پانی کا لوٹا منہ سے لگائے ہوئے ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ کہانی میں ذکر کئے گئے واقعات اب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں لیکن مہاراشٹرا میں رونما ہوا یہ واقعہ بتا تا ہے کہ ان واقعات کی نوعیت مختلف ضرور ہو سکتی ہے لیکن ان کا وجود اب بھی باقی ہے۔ منشی پریم چند کی کئی کہانیاں اسکول اور کالج کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں اور طلباء کو بتایا جاتا ہے کہ کس طرح انہوں نے پرانے دور کی فرسودہ روایات کو مثلاً چھوا چھوت، توہمات وغیرہ کو اپنی کہانیوں کے ذریعہ پیش کیا۔ طلباء ان کی کاریگری کو حسن وخوبی سے لکھتے ہیں تا کہ اچھے نمبر حاصل کرسکیں۔ ٹیچر طلبہ کو بتاتے ہیں کہ ذات پات کی بنا پر تعصب جیسی برائیاں قدیم دور میں پائی جاتی تھیں۔ اب اگر کہیں یہ تھوڑی بہت موجود بھی ہے تو محض دیہاتی علاقوں میں۔ درسی کتابوں میں اس طرح کی کہانیوں کو شامل کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ تعلیم کے ذریعہ ان غیر انسانی روایات سے لڑا جا رہا ہے۔ لیکن ہم تعلیمی نصاب کے علاوہ دیکھیں تو اکثر ریاستوں میں ذات برادری جیسے موضوع پر برائے نام ہی گفتگو ہوتی ہے۔ اسے محض درسی نصاب تک ہی سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اسکول، کالج اور اساتذہ کی تربیت کے اداروں میں ہر جگہ اس موضوع سے گریز کیا جاتا ہے۔ اگر بات ہوتی ہے تو صرف پسماندہ طبقات کے تحفظات اور دستوری اغراض ومقاصد کی۔ اس بات کی امید لگائے رکھنا کہ تعلیم کے ذریعہ ذاتی تعصّبات بھلے ہی یکسر کم نہ ہوں لیکن دھیرے دھیرے اس رویہ میں کمی ضرور آئیگی، اس سے بہتر ہے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ ہمارے تعلیمی ادارے اور نصاب تیار کرنے والی ایجنسی وہ کونسی پالیسی اپناتی ہے جس سے اس عصبیت کو ختم کیا جاسکے۔

اگر ہم اس موضوع پر دو سوالوں کا جواب دیں تو شاید ہم کسی نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ پہلا سوال یہ کہ کیا تعلیم کے ذریعہ پس ماندہ طبقے کا سماجی ومعاشی ارتقاء ہوا ہے؟ دوسرا یہ کہ کیا تعلیم کے ذریعہ ذاتی تعصب میں کمی آئی ہے؟ پہلے سوال کا جواب ''ہاں'' ہے لیکن دوسرے سوال کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا کہ شاید ''کچھ حد تک'' اور یہ عصبیت ہم تعلیمی اداروں کے اندر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ دوستی سے لے کر سیاست تک ہر جگہ ذاتی تعصب کے اثرات ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کالج وغیرہ میں کسی حد تک ایک آزادانہ اور غیر متعصب فضا پروان چڑھانے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے لیکن اس سنجیدہ موضوع کو براہ راست بحث کا حصہ نہیں بنایا جاتا۔ اب یہ بات سمجھی جانے لگی ہے کہ ذات پات کے نظام کو نصاب میں شامل کرنے سے اسے اور بڑھاوا ملے گا۔ حتیٰ کہ وہ ادارے جن کا قیام ہی خاص طبقہ یا ذات کی بنا پر عمل میں آیا تھا وہ بھی دھیرے دھیرے طلباء کے ذہنوں سے اس موضوع کو محو کر دینا چاہتے ہیں۔ اور یہی چیز ہم ٹیچر ٹریننگ اداروں میں بھی دیکھ سکتے۔ آپ کسی شخص کو اس بات کا قائل نہیں کر سکتے کہ وہ وقت نکال کر ایس سی دوبے کی لکھی ہوئی ایسی کتابیں پڑھے جو ذات پات کے نظام پر بحث ومباحثہ کے لئے ابھارتی ہوں۔ ذات پات کے نظام کو بی آر امبیڈکر بہت صحیح نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے کہ یہ ذہنی ترقی کے لئے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ان کے فلسفۂ تعلیم کے کولمبیا سے تعلق رکھنے والے استاد جان دیوے نے اپنے جمہوری ماڈل میں اسے مرکزی مقام دیا ہے۔ ذات پات کا نظام کس طرح خیالات کے بہاؤ اور علم کی رفتار کو روک دیتا ہے اسے واضح کرنے کے لئے امبیڈکر نے social endosmosis کا استعارہ استعال کیا ہے۔ یہ endosmosis جھلی کے ذریعہ ایک خلیہ تک پہنچنے کے لئے سیال راستے کو یقینی بناتا ہے۔ امبیڈکر نے محسوس کیا کہ ذات پات کا یہ نظام بنیادی طور پر سماج کو صحت سے محروم کر دے گا۔ دیوے کی طرح امبیڈکر بھی تعلیم کی طاقت کے قائل ہیں تا کہ اس کے ذریعہ جمہوریت پرورش پائے۔ ہمارا نظام تعلیم کسی بھی طرح کے Endosmosis کو بڑھاوا دینے میں بہت کمزور ثابت ہوا ہے یہاں تک کہ نظم وضبط کے معاملے میں بھی سماجی گروہوں کو اکیلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ سائنس، مینجمینٹ اور انجینئرنگ کے علوم ذات پات کے نظام کا دانشورانہ محاکمہ اور گرفت نہیں کر سکتے۔ روزمرہ کی زندگی میں جو خیال معمول کا حصہ بن کر عام بات ہو گئے ہیں ضرورت ہے کہ انہیں پھر سے از سر نو تازہ کیا جائے۔ اگر آپ متوسط طبقہ کے شہری ہیں تو آپ کو ذات پات کا اس طرح ادراک ہونا چاہئے کہ گویا کچھ ہے جو آپ سے چھن گیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ سوچ آپ کی روز مرہ کی زندگی پر چھا جائے اور آپ کو اپنی پہچان مل جائے۔

بشکریہ، انڈین ایکسپریس

مصنف این سی ای آر ٹی کے سابق ڈائرکٹر ہیں۔

فیمنزم مومنٹ

تاریخ اور اثرات

شمشاد حسین فلاحی

فیمنزم کی اصطلاح ۱۸۸۰ء کے اواخر میں سب سے پہلے 'ہبرٹائن آکلرٹ' نامی خاتون نے، سماج پر مردانہ غلبہ کے خاتمے کے خلاف اور خواتین کے ان حقوق و اختیارات کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کی، جن کی فراہمی کا فرانس کے انقلاب نے عورتوں سے وعدہ کیا تھا۔ یہ اصطلاح پہلی مرتبہ فرانس کے ایک جرنل (جریدے) میں، جس کا نام La Citoyenne تھا، مذکورہ خاتون نے استعمال کی۔ ابتدائی دنوں میں یہ اصطلاح متنوع معانی و مفاہیم کے لیے استعمال ہوئی۔ مردوں کے تحت منظم سماج میں عورتوں کے حقوق و اختیارات کے حصول کی خواتین کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے اسے ایک پرکشش نعرے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ فرانس میں مخصوص سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات میں اس اصطلاح نے خواتین کو حقوق دلانے کی کوششوں میں اہم رول ادا کیا۔ پھر بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں یہ اصطلاح برطانیہ میں متعارف ہوئی اور انگریزی زبان میں استعمال ہوئی۔ وہاں سے بیسویں صدی کے آغاز میں پہنچی۔ چند برس بعد ۱۹۲۰ء کے قریب فیمنزم کی اصطلاح فرنچ زبان کے ذریعہ ساتھ ہی مصر پہنچ کر عرب دنیا میں یا کہیے مسلم دنیا میں داخل ہوئی۔ عربی میں اس کا ترجمہ ''نسائیہ'' سے کیا گیا۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ فرنچ فیمنزم برطانوی فیمنزم نہ تھا اور نہ ہی برطانوی فیمنزم جوں کا توں امریکہ پہنچا۔ یہ اصطلاح اگرچہ خصوصاً فرانس میں ایجاد ہوئی مگر ہر جگہ اس نے مقامی حالات و کوائف اور سماجی و معاشرتی تانے بانے کی مطابق شکل و صورت اختیار کی۔ چنانچہ جب یہ اصطلاح مصر میں متعارف ہوئی تو وہاں بھی اس کے مدعا کے تعیین میں سماجی، سیاسی اور مذہبی و معاشرتی حالات کا دخل تھا۔ البتہ پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر مغربی دنیا میں عورت کی مظلومیت کے ردِعمل میں، یہ ایک تحریک کی شکل میں ابھری۔ پھر یوروپ میں اور پھر باقی دنیا میں پھیلتی گئی۔

فیمنزم تحریک کی فکر کا بنیادی عنصر سماج میں مردوں کے غلبہ کے خلاف جدو جہد ہے۔ یہ تحریک خواتین کے قانونی، معاشی اور سیاسی حقوق کے حصول کی خاطر برپا ہوئی۔ پھر بہت سے موضوعات اس کا موضوع بحث بنے۔ مثلاً عورت کے لیے ملکیت کا حق، نوکریوں میں یکساں مواقع، جنسی تشدد سے تحفظ، سیاسی انتخاب میں ووٹ کا حق، بچے پیدا کرنے یا نہ کرنے کے اختیار، جنسی آزادی، اسقاطِ حمل کا حق، طلاق کا اختیار، شادی کی لازمیت کا خاتمہ، ہم جنسی کجروی کی آزادی۔

ادوار

اس تحریک کی تاریخ لکھنے والوں کے مطابق اسے تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے جسے وہ ''ویو'' یا لہر کا نام دیتے ہیں۔ اس کی پہلی 'لہر' کو وہ ابتدائی دور سے بیسویں صدی کے ۱۹۶۰ء تک شمار کرتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں جب یہ نظریہ امریکہ پہنچا تو وہاں کی معروف قانون داں، سوشلسٹ لیڈر اور صحافی خاتون Crystal Eastman نے ایک مضمون لکھا۔ اس نے لکھا کہ برتھ کنٹرول (ضبط ولادت) عورت کا بنیادی حق ہے جو اسے بہر حال ملنا چاہیے تاکہ وہ جدید دنیا میں پوری طرح سے اپنی شرکت کو یقینی بنا سکے۔ اس مضمون میں اس نے امریکی خواتین کو للکارا کہ اس نے کہا ہے کہ فیمنزم باشعور، حوصلہ مند، اور ذہین لوگوں کے مطالبات کا حامی ہے تو یقیناً اسے خواتین کی حمایت حاصل ہوکر رہے گی۔ اس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس سلسلے کے پرانے قوانین کو تبدیل کیا جانا چاہیے۔ ان کے اس مضمون نے امریکی خواتین میں مقبولیت حاصل کی خصوصاً برتھ کنٹرول کے موضوع پر زبردست حمایت ملی اور پھر قوانین میں تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ خاتون امریکہ میں فیمنسٹ تحریک کی پائینر (روح رواں) تصور کی جاتی ہے۔ ۸/جولائی ۱۹۲۸ء کو انتقال ہوا۔

دوسری 'لہر' کا دور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کا کہا جاتا ہے۔ اس دور میں اس تحریک کو نظریاتی بنیادیں بھی فراہم ہوئیں اور سیاسی، سماجی اور معاشی و معاشرتی حلقوں میں سازگار ماحول میسر آیا۔ اس مدت میں عورتوں کو یکساں معاشی مواقع ملنے شروع ہوئے اور صنفی تفریق کا قانونی طور پر خاتمہ شروع ہوگیا۔ اس دوران یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے اور انسانی پیدائش کا جو طبعی نظام عورت کے ساتھ لگا ہے وہ بھی صرف اس وجہ سے ہے کہ سماجی اور تہذیبی اعتبار سے اس کام کو کرنے کے لیے عورت کو تیار کیا گیا ہے یعنی Conditioning کی گئی ہے۔ اس کی تائید میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی بعض تدابیر کو پیش کیا گیا اور کہا گیا جہاں مرد بھی عورت کی طرح معمولی جسمانی تبدیلی کے ساتھ بچے پیدا کر سکتے ہیں۔ گویا سائنسی و تکنیکی طریقوں سے مرد کو عورت اور عورت کو مرد میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

اس تحریک کی تیسری لہر ۱۹۹۰ کے بعد کا دور ہے جو ہنوز جاری ہے۔ اس دور میں پہلے دور کی حصول یابیوں کے منفی اثرات کی تلافی کی کوشش کی گئی۔ پرانے نظریات کے ساتھ کچھ نئے خیالات بھی شامل ہوئے۔ عورت کے بچے پیدا کرنے کے اختیار جیسے مسائل پر زور دیا جاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہم جنس پرستی اور کج روی کی آزادی شامل ہوگئی۔ جنس کی مکمل تفریق کے خاتمے کا خیال پیش کیا گیا۔ معاشی حقوق اور سماجی انصاف کے لیے لڑائی بھی ایجنڈے میں شامل ہوگئی۔

اس تحریک کو نظریاتی بنیادیں فراہم کرنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے میں کلیدی رول فرانسیسی ''مفکر و مصنف'' خاتون سائمن دی بوائر (Simone De Beavoir) نے ادا کیا۔ اس کی کتاب ''دی سکینڈ سیکس'' دوسری جنس نے تہلکہ مچادیا جو ۱۹۴۹ء میں لکھی گئی۔ مذکورہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں انگریزی میں ترجمہ کے ساتھ سامنے آئی۔ اس کتاب میں مصنفہ نے اپنے خیال میں، ان عوامل پر بحث کی جو مردوں کے مقابلے میں باصلاحیت خواتین کی مسابقت کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک ہی پیشہ یا کام میں عورت کو کم تنخواہ دی جاتی ہے۔ اس پر گھریلو ذمہ داریاں ہیں۔ معاشرے کی جانب سے باصلاحیت خواتین کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ خواتین کی کامیابی کی صورت میں شوہر سے مخاصمت ہوتی ہے۔ عورت اپنی مرضی کے شوہر کا انتخاب نہیں کرپاتی۔ یہ سب عورت کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ بوئرا نے خواتین کو یہ بات پُرزور انداز میں بتائی کہ عورت اس لیے مرد سے پیچھے رہ جاتی ہے کیوں کہ اس میں حوصلے کی کمی ہوتی ہے، اس کا سبب وہ سماجی و معاشرتی حالات ہیں جن میں وہ پرورش پاتی ہے۔ لڑکی کو بتایا جاتا ہے کہ اسے اپنی ماں کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں اور لڑکوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ انہیں اپنے باپ کے نامکمل مشن اور ذمہ داریوں کی تکمیل کرنی ہے۔

سائمن دی بوائر کی کتاب اور دیگر سماجی، سیاسی اور معاشرتی عوامل نے مل کر ان خیالات کو ایک باقاعدہ تحریک کی شکل دی جو Le Mouvent de Liberation des Femmes کے نام سے جانی گئی۔ اس کا ترجمہ ہم دی وومنس لبریشن موومنٹ کے نام سے کرسکتے ہیں۔ اس تحریک کے بانیان میں سائمن دی بوار کے علاوہ کرسٹن روک فرٹ، کرسٹن ڈیلفی اور اینے ٹرسٹان شامل ہیں۔ پرعزم خواتین کے اس گروپ نے نظریات کو عمل میں تبدیل کرنے کی جدوجہد شروع کردی۔ چنانچہ ایک باضابطہ فیمنسٹ موومنٹ کا آغاز ہوا جس کے اثرات آج ہم مشرق و مغرب میں دیکھ رہے ہیں۔ اس تحریک کے نتیجے میں اس زمانے میں خواتین کو مردوں کے مساوی چند حقوق ملے۔ مثلاً مردوں کے مماثل یکساں تعلیم کا حق، کام کرنے کا حق اور ووٹ کا حق۔ لیکن اس تحریک کے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اسقاط حمل پر پابندی تھی اور موانع حمل کے ذرائع کے استعمال پر پابندی تھی۔ اس تحریک نے اس چیز کو عورت کے حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا اور اس کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ انھوں نے ایک اعلامیہ جاری کیا جس کا نام 'Le Manifests de 343' تھا۔ اس میں ۳۴۳ خواتین کے دستخط تھے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ انھوں نے غیر قانونی طور پر اسقاط حمل کرایا ہے۔ یہ اعلامیہ ۵/اپریل ۱۹۷۱ء کو فرانس کے دو مشہور اخبارات میں شائع ہوا۔ اس اعلامیہ کی اشاعت کے نتیجے میں اس گروپ کو زبردست حمایت حاصل ہوئی اور ۱۹۷۵ء خواتین کو اسقاط حمل کرانے کی آزادی کا قانون پاس کردیا گیا۔

خواتین کی اس تحریک نے مغربی معاشرے کو تبدیل کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں خواتین کی پریشانیوں (Sufferings) میں کمی آئی، طلاق کی کاروائی عورت کی جانب سے شروع کیے جانے کی قانونی اجازت ملی، اسے حق ملا کہ وہ بلا کسی وجہ (No Fault Divorce) کے بھی شوہر سے طلاق لے سکتی ہے۔ اسی طرح وہ بچہ پیدا کرنے یا استقرار حمل کے لیے بھی آزاد ہوگی۔ اب بچہ پیدا کرنا یا نہ کرنا اس کا انفرادی فیصلہ تھا۔ اس کے لیے وہ تمام ذرائع اور وسائل کے استعمال کے لیے آزاد تھی جو اس راہ میں اس کی معاونت کریں۔ ساتھ ہی اسے جائیداد رکھنے کا حق یعنی حق ملکیت ملا، نوکریوں کے یکساں مواقع ملے اور مردوں کے قریب قریب تنخواہیں ملنے لگیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیز تک عورتوں کی رسائی آسان ہوگئی۔

سائمن دی بوئرا جو ۹ر جنوری ۱۹۰۸ء کو پیرس میں پیدا ہوئی۔ وہ اس تحریک کی روح رواں قرار پاتی ہے۔ اس نے نہ صرف نظریاتی بنیادیں فراہم کیں بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے مغرب و مشرق میں اپنے نظریات پر مبنی خواتین کے حقوق کے لیے مضبوط کار تحریک برپا کی۔ اس کے اثرات سے مغرب تو تبدیل ہوا ہی مشرق بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۸۶ء کو جب پیرس میں اس کا انتقال ہوا تو پوری دنیا پر اس کے اثرات پھیل چکے تھے۔ اس کی سب سے تہلکہ خیز کتاب سکنڈ سیکس تھی جس کا اوپر تذکرہ ہوا اس کے علاوہ بھی اس نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں درج ذیل کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتابیں فیمنسٹ موومنٹ کو مضبوط تحریک بنانے میں کامیاب ہوئیں۔

(1) Ethics of Ambiguity

(2) Feminist Ethics

(3) Existencial Feminism

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ فیمنسٹ تحریک انقلاب فرانس کے بعد ابھرنی شروع ہوئی۔ امریکہ و برطانیہ ہوتے ہوئے اس کے اثرات پوری دنیا میں نظر آنے لگے لیکن یہ تحریک ہر جگہ اپنے سماجی، معاشرتی و تہذیبی و سیاسی ماحول میں پروان چڑھی۔ دوسرا دور ایسا ہے جہاں نظریات اور اشوز (مسائل) کو مربوط کیا گیا۔ مغرب کے ترقی یافتہ ہونے کا باعث نظریاتی تیزی سے پھیلے۔ مغرب کے سامراج نے آدھی سے زیادہ دنیا کو اپنی سیاسی و تہذیبی گرفت میں لے رکھا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے چین دنیا کا وہ خطہ رہا ہے جو بیرونی سیاسی و ثقافتی اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رہا ہے لیکن وہاں بھی اس تحریک کے اثرات تھے اور آج بھی ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چائنا میں فیمنسٹ موومنٹ وہاں کی اپنی پیداوار ہے اور وہاں پر اس کی شروعات مغرب کی تحریک سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اس کی جڑیں مورخین ۱۷۹۱ء میں تلاش کرتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پر یہ تحریک خواتین کے بجائے مردوں کے ذریعے شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں انیسویں اور بیسویں صدی میں کئی چینی فیمنسٹ مصنّفین کا نام لیا جاتا ہے۔ انھوں نے خواتین کو ایسے راستے اور طریقے سجھائے جو انہیں مردوں کے مقابل یکساں مواقع فراہم کرکے انہیں مردوں کے تسلط سے آزاد کرا سکیں۔ ان مصنّفین میں لن زونگ سو، ہی زھین اور جین زی فن کے نام لیے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چینی معاشرے میں آج بھی مرد و عورت کے درمیان وہ کشمکش نہیں ہے جو مغربی دنیا میں ہے۔ مغرب میں خاندان کا ادارہ پوری طرح تباہی و بربادی کے دہانے پر ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صنعتی ترقی میں مرد و خواتین کے یکساں طور پر شامل ہونے کے سبب کچھ نہ کچھ نقصان چین میں بھی خاندان کے نظام کو جھیلنا پڑ رہا ہے۔

مذہب پر اثرات:

فیمنسٹ تحریک جس خطے میں برپا ہوئی وہاں چرچ کا مذہبی نظام معاشرے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ یہاں مذہب کی اجارہ داری تھی اور خواتین کے بنیادی انسانی حقوق تک مذہب کے نام پر غصب کیے گئے تھے۔ بعض لوگ فرانس کے انقلاب کو مذہب کے خلاف بغاوت تصور کرتے ہیں۔ وہاں کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی و معاشرتی حالات کے اعتبار سے یہ درست تجزیہ ہے۔ فیمنسٹ تحریک نے مذہبی نظریات پر کاری چوٹ لگائی اور اس مذہبی و تہذیبی نظام کو بھی متاثر کیا جو اس وقت رائج تھا۔ اس تحریک کے اثرات بنیادی طور پر مذہب مخالف تھے، اس نے عوام خصوصاً خواتین کو پاپائی نظام کی گرفت سے آزاد کرانے میں اہم رول ادا کیا اور مذہبی روایتی نظام میں تبدیلی کی ابتدا کی۔ عوام میں مذہب کی پابندیوں سے آزاد ہو کر سوچنے کا خیال پیدا ہوا۔ مذہب کے شارحین نے بھی عورت کو یکے بعد دیگرے مختلف النوع آزادیاں دینی شروع کردیں۔ اکیسویں صدی کی آمد سے کے ساتھ یوروپی دنیا میں چرچ میں خواتین کو وہ عہدے دیے جانے لگے جو پہلے صرف مردوں کے لیے خاص ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح یہودیت کے نظام میں بھی خواتین کو ربّی اور کینٹرس کے درجے دیے جانے لگے جو پہلے صرف مردوں کو دیے جاتے تھے۔ اس کی مثال ہندوستانی سماج میں بھی ملتی ہے جہاں خواتین کو بہت سارے مندروں اور عبادت گاہوں میں جانے کی اجازت نہ تھی لیکن اب وہاں خواتین بھی جاتی ہیں۔ اس سلسلے کی تازہ ترین مثال کیرلا کے سبری مالا مندر میں خواتین کے داخلے کی اجازت ہے جو سپریم کورٹ نے حال ہی میں اپنے ایک فیصلے میں دی ہے۔

خواتین پر مذہب کے تسلط کو رد کرتے ہوئے امریکی خاتون الیزابیتھ کیڈی اسٹانٹن نے مذہب خصوصاً عیسائیت پر تیز و تند حملے کیے۔ وہ ایک ماہر قانون دان، سوشلسٹ لیڈر اور سماج سیوک تھی۔ اسٹانٹن نے اپنی کتاب ''دی ومنس بائبل'' خواتین کی بائیبل جو ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی، میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائیت نے عورت کو قیدی بنایا ہے۔ اب اسے چاہیے کہ وہ مرد اور عورت کو یکساں قرار دے۔ انھوں نے دنیا کو یہ رائے دی کہ مذہبی کتابوں اور مذہب کی تعلیمات کو عورت کے نقطۂ نظر کے مطابق پڑھا جانا چاہیے اور عورت سے ہمدردانہ حامی جذبات کے ساتھ نئے انداز سے انھیں سمجھا جانا چاہیے۔ اس تحریک کی وہ پہلی مفکر آئیڈیالاگ ہے۔ اس نے کہا کہ مذہبی روایات، اعمال اور تعلیمات کو جب تک

خواتین کے نقطۂ نظر سے نہیں پڑھا جاتا اس وقت تک عورت مذہب کی رسیوں سے نہیں نکل سکتی۔ الیزابیتھ کیڈی اسٹانٹن کا ۱۹۰۲ء میں نیویارک میں انتقال ہوا۔ انھوں نے اس تحریک کے لیے بڑا نظریاتی لٹریچر چھوڑا ہے جس میں درجنوں کتابیں شامل ہیں۔

اسلامک فیمنزم:

۱۹۹۰ء کی دہائی میں مسلم دنیا میں بھی اسلامک فیمنزم کی اصطلاح استعمال ہونی شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے یہ ترکی میں استعمال ہوئی اس کے بعد ایران اور پھر سعودی عرب میں ۱۹۹۶ء میں اس وقت سامنے آئی جب سعودی خاتون ماعی یمانی نے اپنی کتاب Feminism and Islam شائع کی۔ جنوبی افریقہ کی مشہور خاتون شمیمہ شیخ نے بھی اس اصطلاح کا استعمال اپنی تقریروں اور تحریروں میں کرنا شروع کر دیا اور اب تو لوگ اس لفظ کو استعمال کرتے وقت غور وفکر بھی نہیں کرتے اور عورت کے سلسلے میں اسلام کے نظریے کو مغربی فیمنزم کے بالمقابل پیش کرنے کے لیے اس اصطلاح کا استعمال بے دریغ استعمال کر ڈالتے ہیں۔

جن لوگوں نے اسلام کے نظریے کی تفہیم کے لیے اس اصطلاح کو وضع کیا اور اس کے استعمال کو رائج کیا ان کے بارے میں یہ کہنے کی تو ہم جرأت نہیں کر سکتے کہ وہ عورت کے بارے میں اور اس سلسلہ کی قرآن وحدیث کی تعلیمات سے ناواقف رہے ہوں گے مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے رائج الوقت فیمنسٹ موومنٹ کے سامنے اسلام کا نظریہ پیش کرنے کے لیے انہی کی اصطلاح کو آلہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہ ان کی نیک نیتی بھی ہوسکتی ہے اور سادہ لوحی بھی مگر اتنا تو واضح ہے کہ جن مسائل اور حقوق واختیارات کے تناظر میں فرانس، برطانیہ، امریکہ اور پورے مغرب میں یہ تحریک شروع ہوئی وہ تمام کے تمام مسائل اسلام اس تحریک سے بارہ صدیاں قبل ہی حل کر چکا تھا۔

فیمنزم کی اس بحث میں اس بات کا موقع نہیں کہ اسلام کے ان حقوق واختیارات کی وضاحت کی جائے جو اس نے عورت کو دیے ہیں۔ جبکہ مغرب کی عورت دو صدیوں پر محیط طویل جدوجہد کے بعد ان کے حصول میں کامیاب ہوئی اور وہ بھی ناقص صورت میں۔ مغرب میں اس تحریک کے نتیجے میں مرد و عورت جو ایک دوسرے کا تکملہ یا کمپلیمنٹ ہیں وہ ایک دوسرے کی ضد اور مدِ مقابل بن گئے اور اس کے نتیجے میں سماج اور معاشرہ انتشار کا شکار ہے، اسلام کا معاشرہ اس سے یکسر محفوظ رہا۔ اسلام نے مرد و عورت کے حقوق واختیارات کو مرد و عورت کے درمیان کشمکش اور جنگ کا سبب بنائے بنا انہیں اولیاء بعضھم ببعض بنا کر ایک مثالی معاشرہ بنا دیا۔ یہاں عورت گھر کی تنظیم وترتیب میں مثالی نظر آتی ہے تو میدان جنگ میں اپنا رول بھی نبھاتی نظر آتی ہے۔ وہ معاشی جدوجہد میں بھی شریک ہے اور تعلیم اور سماجی خدمت کے میدان میں بھی اس کا گراں قدر رول ہے۔

اب ہمارے لیے دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلام کے عورت کو عطاء کردہ حقوق اور اختیارات کو ہمارے معاشرے میں بھی عملاً چلتا پھرتا نظر آنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام کی تعلیمات کو جو عورت سے متعلق دی گئی ہیں انہیں موجودہ تحریک سے مرعوب ومتاثر ہوئے بنا لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ جان سکیں گے کہ موجودہ دور کی عورت نے طویل جدوجہد کے بعد جو کچھ پایا ہے وہ بہت معمولی ہے، لیکن اس نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ اسلام نے اسے بلا کوئی قیمت وصول کیے حقوق سے نوازا ہے۔

اب ہمارے لیے دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلام کے عورت کو عطاء کردہ حقوق اور اختیارات کو ہمارے معاشرے میں بھی عملاً چلتا پھرتا نظر آنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام کی تعلیمات کو جو عورت سے متعلق دی گئی ہیں انہیں موجودہ تحریک سے مرعوب و متاثر ہوئے بنا لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ جان سکیں گے کہ موجودہ دور کی عورت نے طویل جدوجہد کے بعد جو کچھ پایا ہے وہ بہت معمولی ہے، لیکن اس نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ اسلام نے اسے بلا کوئی قیمت وصول کیے حقوق سے نوازا ہے۔

مصنف ماہنامہ 'حجاب اسلامی' کے ایڈیٹر ہیں۔

غیرمسلموں سے دوستی اور خوشگوار تعلقات

| ابوالاعلی سید سبحانی

اسلامی دعوت کی ایک اہم ضرورت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان، بنیادی اسلامی اصطلاحات کا صحیح فہم حاصل کرنا اور اس کے صحیح مفہوم کو عام کرنا ہے۔ اسلامی دعوت کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ اور اسلام کے داعیوں کے سامنے ایک بڑا چیلنج اسلامی اصطلاحات کا وہ غلط مفہوم ہے جو سماج میں نہ صرف رائج اور عام ہے بلکہ اپنوں کے درمیان بھی اور غیروں کے درمیان بھی بری طرح راسخ ہو چکا ہے، جبکہ حقیقت سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ یہ غلط مفہوم مسلمانوں کے لیے بھی نقصاندہ ہے اور غیر مسلموں کے لیے بھی، یہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی صحیح اور مطلوبہ تصویر نہیں پیش کرتا اور بسا اوقات اسلام سے دوری کا سبب بن جاتا ہے، جبکہ مسلمانوں کے فکر ونظر پر بھی یہ اثر انداز ہوتا ہے اور اسلام کے پیش نظر جن داعیانہ رویوں اور جس داعیانہ کردار کی تشکیل ہے اس میں بھی مانع ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکات نے اسلامی اصطلاحات کی درستگی اور ان کی تفہیم نو پر خاصا زور دیا ہے، چنانچہ اسلامی تحریکات کے لٹریچر کا ایک قابل ذکر حصہ اسی سے متعلق ہے۔ بیسویں صدی میں مولانا مودودی علیہ الرحمہ کا تیار کردہ لٹریچر بالخصوص قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، الجہاد فی الاسلام، سود، پردہ، اور خلافت وملوکیت جیسی کتابیں اس سلسلے میں اہمیت کی حامل ہیں۔

اسلامی اصطلاحات کے مفاہیم ومعانی کی تعیین کے لیے کچھ بنیادی اصولوں کا لحاظ ضروری ہے۔ ان میں سے تین اہم اصولوں کا تذکرہ یہاں کیا جارہا ہے:

(۱) اس بات کا خیال رکھنا کہ اسلامی شریعت کی روح اس ضمن میں کیا ہے۔

(۲) قرآن وسنت میں وہ اصطلاح کہاں کہاں اور کن کن معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔

(۳) قرآن وسنت میں ان اصطلاحات کو کہاں اور کس سیاق میں پیش کیا گیا ہے، اور سیاق کی رعایت اور فہم کس معنی اور مفہوم کو کس طرف لے جاتا ہے۔

غلطی اس وقت ہوتی ہے کہ جب اِن اصطلاحات کو سیاق وسباق سے کاٹ کر اور ان کے صحیح اور درست استعمالات سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کے ظاہری معنی پر اکتفاء کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں شریعت کی روح اور اس کے مقاصد کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں جہاد سے متعلق آیات اور سماجی تعلقات سے متعلق آیات کے سلسلے میں اس طرح کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ جہاد کی آیات کو اُن کے سیاق وسباق سے کاٹ دیا جائے تو اُن کے معانی اور مفاہیم کچھ سے کچھ ہوجائیں گے، اسی طرح سماجی تعلقات سے متعلق آیات کو اُن کے سیاق وسباق سے کاٹ کر پڑھا جائے تو اُن کے معانی ومفاہیم اُس سمت میں لے جائیں گے جو کبھی بھی شریعت کا مقصود نہیں ہوسکتا۔

گزشتہ دنوں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ایک دوست نے درج ذیل سوال بھیجا، اور اس سلسلے میں ناچیز کی رائے جاننے کی کوشش کی، سوال کچھ اس طرح تھا:

''میرے کچھ جاننے والے قرآنی آیات (مثلا سورہ مائدہ کی آیت 51، اور سورہ بقرہ کی آیت 120) کا استعمال ہندوستانی سیاق میں کرتے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ دوستی نہیں کرنی چاہیے، ان سے دور رہنا چاہیے اور ان پر بھروسہ تو بالکل ہی نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ مجھے اس سلسلے میں قرآن وسنت کا حقیقی موقف جاننے کی خواہش ہے۔'' مختلف اسفار کے دوران بھی، جب اسلام اور اسلامی تعلیمات پر گفتگو ہوتی ہے، تو اسی قسم کے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان میں سے بیشتر سوالات کا تعلق انھی غلط مفاہیم سے ہوتا ہے جو بدقسمتی سے ہمارے سماج میں عام ہیں۔ مذکورہ بالا سوال میں بھی دیکھا جائے تو آیات سے استدلال کے سلسلے میں عہد رسالت کے مخصوص یہود ونصاریٰ اور عام غیر مسلموں میں فرق نہیں کیا گیا، اور نہ ہی اولیاء بنانے کا صحیح مفہوم قرآنی استعمالات کی روشنی میں دیکھا گیا، اور نہ سماجی تعلقات کے سلسلے میں شریعت کی روح یعنی تمام ہی غیر مسلموں کے ساتھ نصح وخیر خواہی اور ان کی ہدایت طلبی کے رویے اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا گیا، حالانکہ اگر ان پہلوؤں پر نظر رکھی جاتی تو مسئلہ بہت سادہ اور سمجھ میں آنے والا تھا۔

جہاں تک قرآن مجید میں مذکور آیات جہاد کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں درج ذیل باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں:

(۱) اسلامی شریعت کی روح اس سلسلے میں یہ ہے کہ انسانی سماج کے درمیان صلح ہی بہترین اور پسندیدہ راستہ ہے۔

(۲) قرآن مجید میں موجود نبیوں کی دعوتوں کا مطالعہ کرنے سے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل جدوجہد کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تصادم کا آغاز ہمیشہ باطل کی طرف سے ہوتا ہے، نبیوں اور رسولوں نے ہمیشہ تصادم سے گریز کرتے ہوئے اپنے مشن کی انجام دہی کے لیے پرامن ماحول کو ترجیح دی ہے۔

(۳) قرآن مجید میں جہاد کا لفظ اسلامی جدوجہد کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور قتال کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، لیکن کہیں بھی یہ قتل کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ قتل اور قتال میں بہت ہی واضح فرق پایا جاتا ہے، آیات جہاد کے مطالعہ کے دوران اس فرق کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

(۴) اسلامی شریعت میں جہاد بمعنی قتال میں افراد کے قتل کا تصور سرے سے ہے ہی نہیں، افراد سے تعامل کے سلسلے میں از اوّل تا آخر دعوت دین ہی تنہا آپشن ہے۔

(۵) اسلامی شریعت میں جہاد بمعنی قتال افراد سے نہیں حکومتوں سے کیا جاتا ہے، وہ بھی صرف ان حکومتوں سے جو ظلم وجبر کی روش اختیار کر بیٹھتی ہیں، اور اس میں بھی پیش نظر قتل وخون ہرگز نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصود صرف اور صرف ان کی طاقت توڑنا ہوتا ہے، یہی غزوات نبوی کا بھی امتیاز رہا ہے اور یہی دور اوّل کی دوسری جنگی سرگرمیوں کا بھی امتیاز رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ غزوات میں قتل کیے جانے والے افراد کی مجموعی تعداد زیادہ سے زیادہ سیکڑوں یا چند ایک ہزار تک ہی شمار کی جاتی ہے۔

(۶) جہاد بمعنی قتال کے سلسلے میں یہ بات بھی بہت بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ جہاد بمعنی قتال کا فیصلہ کرنے کا اختیار کچھ افراد یا کسی جماعت کو حاصل نہیں ہے، بلکہ اس فیصلہ کا اختیار صرف اور صرف اسلامی حکومت ہی کرسکتی ہے۔ البتہ جہاد بمعنی اسلامی جدوجہد ہر مسلم فرد کی ذمہ داری ہے اور وہ اس ذمہ داری کے لیے عنداللہ جوابدہ ہوگا۔

(۷) قرآن مجید میں جہاں کہیں جہاد بمعنی قتال کی آیات آئی ہیں وہ مخصوص حالات اور مخصوص واقعات سے تعلق رکھتی ہیں، ان کو عمومی معنی پہنانا کسی بھی طور سے اسلامی شریعت کا مقصود نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سورہ توبہ میں موجود آیات جہاد وقتال اوّل تو کفار مکہ سے تعلق رکھتی ہیں، دوم یہ کہ یہ اس زمانے سے متعلق ہیں جب کہ ان کفار مکہ نے تمام معاہدے توڑ ڈالے تھے اور یہ تمام حدود سے تجاوز کر گئے تھے، چنانچہ ان آیات سے استدلال کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، جس میں یقینی طور پر صورتحال اور اس کے اسباب وعلل کی یکسانیت کو اہمیت دی جائے گی۔

اسی طرح سماجی تعلقات سے متعلق آیات اور احکام کے ضمن میں درج ذیل باتیں پیش نظر رہنی ضروری ہیں:

(۱) اسلامی تعلیمات تکریم بنی آدم اور احترام انسانیت کی تعلیم دیتی ہیں، ہمارے سماجی رویوں میں اس اصول کو ہمیشہ اوّل نمبر حاصل رہنا چاہیے۔

(۲) سماجی تعلقات کے سلسلے میں دوسری اصولی بات یہ ہے کہ اہل ایمان کا دوسری اقوام وملل کے ساتھ رشتہ داعی اور مدعو کا ہے، داعی اور مدعو کا یہ رشتہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ داعی ہر حال میں مدعو کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کرے، اور چونکہ پوری امت مسلمہ داعی کے منصب کی حامل ہے اور اس کی نگاہ میں باقی تمام اقوام وملل مدعو کے مقام پر ہیں، لہٰذا امت مسلمہ کو دیگر اقوام وملل کے ساتھ نہ صرف یہ کہ خوشگوار تعلقات رکھنے چاہئیں بلکہ خوشگوار تعلقات بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، یقینا یہ خوشگوار تعلقات دعوتی عمل کی پہلی سیڑھی ہوتے ہیں، اور ان تعلقات کے پیچھے صرف اور صرف ان کی ہدایت طلبی اور خیر خواہی کا سچا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

(۳) اسلام جن اعلی اخلاق واقدار کی تعلیم دیتا ہے، ان کے سلسلے میں وہ کسی بھی تفریق کا قائل نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات وہ واضح لفظوں میں تفریق سے باز رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ عدل وانصاف کا رویہ، احسان کا رویہ، کمزوروں اور پریشان حالوں کی دیکھ بھال، محتاجوں اور مسکینوں کی حاجت روائی، مظلوموں کا تعاون، وغیرہ یہ تمام اعلی اسلامی اخلاق واقدار بلاتفریق مذہب وملت تمام ہی انسانوں کو اپنا وسیع تر اور ٹھنڈا سا یہ فراہم کرتے ہیں۔

(۴) قرآن مجید فساد فی الارض کو انسانوں کا ذاتی مسئلہ بنا کر پیش کرتا ہے، وہ کسی بھی سطح پر اور کسی بھی درجہ میں ہو، اس کے خلاف انسانوں کو جدوجہد پر ابھارتا ہے۔ اسی طرح ان تمام برائیوں کے خلاف سماج کا ذہن تیار کرتا ہے جو سماج کو تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں، یقینا فساد فی الارض کے خلاف اور سماج کو تباہی کی طرف لے جانے والی سماجی برائیوں کے خلاف جدوجہد کے لیے ضروری ہے کہ سماج کے تمام طبقات کو اس میں شریک کیا جائے، یہ سماجی جدوجہد داعی کو سماج میں ایک مضبوط پوزیشن اور مقام عطا کرے گی اور سماج اور داعی کے درمیان موجود دوریوں کو کم سے کم کرے گی۔

ان اصولی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان قرآنی آیات پر غور کرنے کی ضرورت ہے جن میں یہود ونصاری کو اولیاء بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ اس میں اوّل تو ان آیات کا سیاق سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ اس زمانے کے اُن یہود ونصاری سے متعلق ہیں جنھوں نے اسلام کے خلاف ہر ممکن سازش کر ڈالی تھی، دوم اس میں ولی کے مفہوم کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ولی بنانے اور عام انسانی بنیادوں پر خوش گوار سماجی تعلقات استوار کرنے میں کیا فرق ہے، ولی قرآن مجید میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے، وہاں راز دار بنانے اور اپنی زندگی کی باگ ڈور کسی کے حوالے کر دینے جیسے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مثال کے طور پر سورہ مائدہ کی آیت 51 ہے: **یا ایھا الذین آمنو لا تتخذو الیھود و النصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض و من یتولھم منکم فانہ منھم۔ ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین** اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو کوئی تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے تو وہ انہیں سے ہے، اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اس آیت سے پہلے اور بعد کی آیتوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں بہت ہی واضح طور سے منافقین کو مخاطب بنایا گیا ہے جنھوں نے یہود ونصاری کو اپنا ولی بنا رکھا تھا اور وہ اپنے اولیاء کے کہنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مشن کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ اور مسلمانوں کے درمیان رہ کر کشمکش کے دوران جو بھی راز کی باتیں ہو سکتی تھیں وہ اپنے اولیاء تک پہنچانے کی مذموم حرکت انجام دیتے تھے۔

وہ سماجی تعلقات جو دعوتی مشن اور اسلامی جدوجہد کے حق میں مفید ہوں اسلام ان کی ترغیب دیتا ہے اور وہ تمام ہی سماجی تعلقات اور سماجی نسبتیں جو اسلامی جدوجہد اور دعوتی مشن کو نقصان پہنچا سکتی ہوں اسلام ان کے سلسلے میں سختی کے ساتھ خبردار کرتا ہے۔ دین کا صحیح فہم حاصل کرنا بھی دعوتی مشن کی مضبوطی کے لیے ضروری ہے اور اس فہم کو عام کرنا بھی۔ خاص طور سے ان حالات میں جبکہ غلط فہمیوں اور نفرتوں کا بازار مستقل گرم رکھنے کے لیے بڑے پیمانے پر کوششیں ہو رہی ہیں اہل حق اور داعیان دین کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔

واللہ ولی التوفیق وھو حسن المآب

آپ ہیں احمد و مجتبیٰ مصطفیٰ
آپ ہیں رہبر و رہنما مصطفیٰ

آپ کی مدح کرتا ہے سارا جہاں
ہے خدا مدح خواں آپ کا مصطفی

ساری دنیا تھی ظلمت میں ڈوبی ہوئی
آپ نے اس کو بخشی ضیاء مصطفی

تیرے صدیق وفاروق وعثماں علی
آئینہ دار دین ہدیٰ مصطفی

نعت کا حق ادا ہو بھلا کس طرح
مدح و توصیف سے ماورا مصطفی

آپ سے بے رخی سربسر گمرہی
عالمی دائمی پیشوا مصطفی

آپ کی ذات سارے مسائل کا حل
آپ ہیں ہر مرض کی دوا مصطفی

سیدالمرسلیں شاہ دنیا ودیں
مختصر یہ کہ بعد از خدا مصطفی

آرزو ہے کہ زندہ رہوں جب تلک
نام لیتا رہوں آپ کا مصطفی

جب ہو عارفؔ کا یارب دم واپسی
لب پہ اس کے رہے مصطفی مصطفی

احسان الحق عارف

مومن فہیم احمد

صحافت

کرئیر، مواقع اور وقت کی اہم ضرورت

جرنلزم اور میڈیا کی اہمیت سے موجودہ دور میں نہ انکار ممکن ہے اور نہ ہی فرار۔ میڈیا کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ ٹیلی وژن، اخبارات، میگزین روزانہ کے واقعات اور اہم خبریں ناظرین اور قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ اس شعبہ میں محنتی اور ایماندار افراد کی کمی ہمیشہ سے رہی ہے۔ ایسے نوجوان جو خبروں کے تجزیے، قومی و بین الاقوامی سیاسی و معاشی معاملات میں دلچسپی رکھتے ہوں اور مطالعہ کا بھی شوق ہو وہ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا میں اپنا کریئر بنا سکتے ہیں۔

جرنلزم اور ماس میڈیا کا مفہوم و فرق : خبروں کی ترسیل کے تمام ذرائع چاہے وہ اخبارات، میگزین، ٹی وی چینلس اور آن لائن ویب پورٹل سے متعلق ہوں وہ تمام جرنلزم کی تعریف میں شامل ہیں یعنی یہ کہا جاسکتا ہے خبروں کی رپورٹنگ کسی بھی ذریعے سے کرنا جرنلزم کہلاتا ہے جبکہ ماس میڈیا یا ماس کمیونکیشن میڈیا کے مختلف ذرائع سے عوام تک پیغام پہنچایا، معلومات یا دلچسپی کے سامان مہیا کرانے پر مشتمل ہے۔ اخبارات، ٹی وی، میگزین یا ڈیجیٹل ذرائع سے خبریں پہنچانا جرنلزم کا حصہ ہیں۔ شعبوں کے لحاظ سے جرنلزم کو تین درجات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) پرنٹ (اخبارات اور میگزین وغیرہ) (۲) الیکٹرونک (ٹی وی اور ریڈیو وغیرہ) (۳) آن لائن (انٹرنیٹ پر ویب پورٹل یا اپلیکیشن کے ذریعے خبریں پہنچانا وغیرہ)۔ زمانے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان میں سب سے قدیم پرنٹ میڈیا ہی ہے کیونکہ سب سے پہلے اخبارات ہی لوگوں تک خبر کی ترسیل کا ذریعہ بنے۔ لیکن موجودہ وقت میں آن لائن جرنلزم نے کافی اہمیت اور لوگوں تک بآسانی پہنچنے کی استطاعت حاصل کرلی ہے، دی کوئینٹ، دی وائر، ٹوسرکلس ڈاٹ نیٹ وغیرہ آن لائن جرنلزم کی اہم مثالیں ہیں۔ جبکہ ماس کمیونکیشن یا ماس میڈیا زیادہ وسیع ذرائع کا احاطہ کرتا ہے جن میں تھیٹر، ٹی وی، ریڈیو، فلم میکنگ، ایڈورٹائزنگ، رابطہ عامہ وغیرہ شامل ہیں۔

کورس کی ساخت : جرنلزم بنیادی طور پر سیاسیات، معاشیات، کمیونکیشن، جرنلزم کی تاریخ اور تحقیق کے ذرائع وغیرہ کے جزئیات اور استعمال پر مشتمل ہے۔ اس کا مقصد طلبہ کو سماجی حقیقتوں کو اجاگر کرنے، ایک نظریاتی فریم ورک قایم کرنے اور میڈیا کو بطور رابطہ کار ایجنسی کے پیش کرنے کے قابل بنانا ہے جبکہ ماس کمیونکیشن میں بڑے پیمانے پر سماجی اثرات مرتب کرنے والی تحریریں اور سمعی و بصری مواد تیار کرنا اور اس کی اشاعت کرنا شامل ہے۔ جرنلزم میں عام طور پر صرف اعداد و شمار اور حقیقت سے واقف کرانا ہوتا ہے جبکہ ماس کمیونکیشن کے ذرائع ماسیس (عوام) کی ذہن سازی اور معاملات کے نقطہ نظر کو مقامی، علاقائی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر پیش کرنے سے متعلق ہیں۔

کورس کی قسمیں : موجودہ دور میں جرنلزم اور ماس کمیونکیشن کے کورسیس کئی طرح سے کیے جاسکتے ہیں۔ جن میں سرٹیفکیٹ، ڈپلوما، پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما، ڈگری اور پوسٹ گریجویشن شامل ہیں۔ ان کورسیس میں سرٹیفکیٹ ان جرنلزم، ڈپلوما ان جرنلزم، پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس میڈیا، بیچلرس ان جرنلزم، بیچلرس ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن، بیچلرس ان ماس کمیونکیشن اینڈ ماس میڈیا، بیچلرس ان کمیونکیشن اسٹڈیز وغیرہ اہم نام ہیں۔

روزگار کے مواقع: موجودہ دور میں اس شعبے میں روزگار کے مواقع بڑھتے جا رہے ہیں ایک جرنلسٹ کے طور پر اخبارات، میگزین، ٹی وی چینلس، نیوز پورٹلس وغیرہ میں اس کے اچھے مواقع ہیں جبکہ ماس میڈیا میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے کانٹینٹ رائیٹنگ، ایڈ ور ٹائزنگ، فلم، غیر تجارتی اداروں، رابطہ عامہ، کارپوریٹ کمیونکیشن اور دیگر میڈیا ایجنسیوں میں روزگار کے مواقع دستیاب ہیں۔

آمدنی و مراعات: اس شعبے میں ایک جرنلسٹ یا میڈیا پرسن کی آمدنی کتنی ہوگی یہ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کس ادارے میں کیا کام کرتا ہے؟ اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ عام طور پر جرنلزم میں آمدنی کم ہوتی ہے اس لیے اگر آپ آمدنی کے لیے کریئر بنانا چاہتے ہیں تو ماس میڈیا آپ کے لیے بہتر ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک نیوز ایجنسی کے مقابلے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی آپ کو بہتر تنخواہ اور مراعات دے سکتی ہے اگر آپ کے پاس اچھے آئیڈیاز (خیالات) یا تحریریں ہیں۔ لیکن بڑے نیوز چینلس اور اخبارات امیدوار کی صلاحیت کے مطابق اچھی تنخواہیں اور مراعات دیتی ہیں۔

کورس کی مدت، فیس و اہلیت: جرنلزم و ماس میڈیا کے کورسیس عام طور پر ڈپلوما کورس ایک سال جبکہ گریجویشن تین سال پر محیط ہے۔ فیس دس ہزار سے لے کر ڈھائی لاکھ روپئے تک ہوسکتی ہے۔ فیس انسٹی ٹیوٹ کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ گریجویشن کے بعد دو سال کا پوسٹ گریجویشن بھی اس شعبے میں کیا جاسکتا ہے۔ بھارت میں کچھ کالجس میں 'بی اے ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن' اور کچھ کالجز میں 'بی ایس سی ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن' کے کورسیس جاری ہیں۔ اسی طرح ماسٹرس لیول پر 'ایم اے' اور 'ایم ایس سی ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونکیشن یا ماس میڈیا' کے طور پر کیے جاسکتے ہیں ۔ بیچلر کورس کے لیے طلبہ کو بارہویں کامیاب کرنا لازمی ہے کچھ ادارے اپنا انٹرنس بھی منعقد کرتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر داخلہ دیتے ہیں۔

جرنلسٹ کے لیے درکار خوبیاں: اس شعبہ میں کریئر بنانے کے لیے امیدوار کو چند خوبیوں اور صلاحیتوں کا مالک ہونا ضروری ہے۔ جو درج ذیل ہیں۔ (۱) تحقیق پسند یا متجسس فطرت کا حامل ہونا۔ (۲) چوکنا رہنے والا طرز عمل اور حالات میں تبدیلی کو قبول کرنے والا ذہن۔ (۳) زباندانی اور رابطہ کی مہارتیں۔ (۳) خود اعتماد، پُر جوش اور صبر کے مادے سے لبریز۔ (۴) حقیقتوں کو سمجھنے والا اور اعداد و شمار سے تجزیے کرنے کی صلاحیت کا حامل۔ (۴) مختلف سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، ثقافتی معلومات اور حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہنے والا۔

کریئر کے مواقع: جرنلزم اور ماس کمیونکیشن کے گریجویٹس مختلف شعبوں میں روزگار حاصل کر سکتے ہیں جن میں روایتی اخبارات اور میگزین میں لکھنا، اشتہار بازی کے شعبے میں اور تحقیقی اداروں میں روزگار شامل ہیں۔ ماس کمیونکیشن کے گریجویٹس کو درج ذیل ذمہ داریاں دی جاتی ہیں۔ (۱) جرنلسٹ اور نیوز رپورٹر۔ (۲) فیشن فوٹو گرافر (۳) ٹیلی وژن نامہ نگار (۴) ریڈیو جاکی (آر جے) (۵) عوامی رابطہ آفیسر (۶) تحریری مواد تیار کرنے والا (کانٹینٹ رائیٹر) (۷) اخبار، میگزین یا ویب پورٹل کے ایڈیٹر کے طور پر۔

کریئر کی خوبیاں اور خامیاں: جرنلزم اور ماس میڈیا میں کریئر شناخت، شہرت اور اچھی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ جن لوگوں کو چیلنج سے بھرپور کام پسند ہے یا جو افراد کام کے ساتھ ساتھ سفر کے دلدادہ ہوں ان کے لیے یہ مناسب کریئر ہے اور ایک اطمینان بھری جاب ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کی چند خامیاں بھی ہیں جن میں غیر معمولی ہیجان، الجھن سے پُر اور وقت بے وقت پر کام، ذاتی زندگی کا متاثر ہونا اور سماجی و سیاسی دباؤ کے تحت تناؤ کا شکار ہونا جیسے منفی عوامل بھی شامل ہیں۔

چند معروف یونیورسٹیز اور کالجیز: ملک میں تقریباً ہر ریاست میں جرنلزم اور ماس میڈیا کے اچھے کالیجز موجود ہیں لیکن تعلیمی اداروں کی رینکنگ کے لحاظ سے چند معروف اداروں کے نام دیے جا رہے ہیں۔ (۱) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی (۲) لیڈی شری رام کالج دہلی (۳) سمبائسیس انسٹی ٹیوٹ پونے (۴) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونکیشن دہلی (۵) ٹائمز اسکول آف جرنلزم دہلی (۶) ایشین کالج آف جرنلزم چینائی (۷) زیویئرس انسٹی ٹیوٹ آف کمیونکیشن ممبئی (۸) فلم اینڈ ٹیلیوژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا پونے (۹) صوفیہ کالج فار ویمن ممبئی (۱۰) کرائسٹ یونیورسٹی بنگلور (۱۱) کے سی کالج ممبئی (۱۲) ایمیٹی اسکول آف کمیونکیشن نوائیڈا (۱۳) این آئی ایم ایس یونیورسٹی جے پور (۱۴) رام نارائن روئیا کالج ممبئی (۱۵) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد (۱۶) شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی کالینا ممبئی (۱۷) لالہ لاجپت رائے کالج ممبئی (۱۸) میسور یونیورسٹی میسور (۲۰) اعجاز رضوی کالج لکھنو (۲۱) جاگرن انسٹی ٹیوٹ دہلی (۲۲) ایم جی ایم کالج آف جرنلزم اورنگ آباد (۲۳) گروارے انسٹی ٹیوٹ کالینا، ممبئی (۲۴) ایس آئی ای ایس کالج ممبئی وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی کئی کالیجز اور یونیورسٹیوں میں جرنلزم اور ماس میڈیا / ماس کمیونکیشن کے کورسیس جاری ہیں جس کی تفصیل انٹرنیٹ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ٹرمپ، صحافتی آزادی کو دبا رہے ہیں!

امریکہ میں آزادی صحافت کے خلاف جس طرح کے اقدامات کئے جا رہے ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔

| فیصل فاروق

دنیا بھر میں صحافیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اِس کے باوجود دنیا کے کئی ممالک میں صحافی برادری کو مختلف قسم کی مشکلات اور خطرات کا سامنا ہے۔ گزشتہ دِنوں وسط مدتی انتخابات سے متعلق وہائٹ ہاؤس میں پریس کانفرنس کے دوران عالمی نشریاتی ادارے سی این این کے صحافی جم اکوسٹا نے صدر ٹرمپ سے وسطی امریکہ میں سرحد کے قریب آنے والے تارکین وطن کے قافلے کے بارے میں سوال کیا تھا۔ جس پر صدر امریکہ نے بے حد غصے میں اُنہیں کہا کہ ''تم بہت برے اور بدتمیز شخص ہو، مائیک چھوڑو۔'' اِس کے بعد وہائٹ ہاؤس کی ایک اہلکار نے صحافی سے مائیک لینے کی کوشش کی لیکن اُنہوں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

ٹرمپ سے سخت اور تلخ سوال پوچھنے پر صحافی جم اکوسٹا پر وہائٹ ہاؤس میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی اور اُن کا اجازت نامہ معطل کر دیا گیا۔ ڈونالڈ ٹرمپ کی اِس حرکت کی پُرزور مذمت ہونی چاہئے۔ رپورٹس کے مطابق سی این این کے صحافی جم اکوسٹا سے ٹرمپ کی کہاسنی کا جو ویڈیو میڈیا اور سوشل میڈیا پر تیزی سے پھیلا، اِس بابت امریکی میڈیا کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہیں نہ کہیں یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ جم اکوسٹا ٹرمپ کو چھیڑ کر کیمرے کو اپنی جانب مرکوز رکھنا چاہتے تھے تاکہ سی این این یہ دکھلائے کہ کس طرح ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے ایک بہادر صحافی نے ڈونالڈ ٹرمپ کو ٹوکا اور حقائق جاننے کی کوشش کی۔

اِس الزام میں کتنی صداقت ہے اور کتنی دروغ گوئی یہ تو ہم نہیں جانتے مگر ویڈیو دیکھنے سے ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ ٹرمپ کی طرف سے مناسب جواب نہ ملنے پر اُنہوں نے اپنی بات بار بار کہنے کو ترجیح دی۔ ٹرمپ نے جم اکوسٹا پر جھوٹا الزام لگانے کی کوشش کی۔ وہائٹ ہاؤس کی ترجمان سارہ سینڈرز نے کہا کہ صحافی اکوسٹا کا اجازت نامہ معطل کرنے کی وجہ اُن کے سوالات نہیں بلکہ 'اُس نوجوان لڑکی کو ہاتھ لگانا تھا'۔ خیال رہے کہ وسط مدتی انتخابات کی مہم کے دوران ڈونالڈ ٹرمپ نے کہا تھا کہ میکسیکو سے امریکہ میں داخل ہونے والے پناہ گزینوں نے اگر فورسز پر پتھراؤ کیا تو اُنہیں براہ راست گولی مار دی جائے گی۔

ٹرمپ کے جارحانہ مزاج کی وجہ سے اُن کے اور امریکی میڈیا کے درمیان تلخی بڑھی ہے۔ چند ماہ قبل ٹرمپ نے امریکی میڈیا کو عوام کا دشمن اور اپوزیشن پارٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ جس کا سخت نوٹس لیتے ہوئے آپسی تال میل کے ساتھ ساڑھے تین سو سے زیادہ امریکی اخبارات نے ڈونالڈ ٹرمپ کے خلاف اداریے لکھے تھے۔ اِس مہم میں امریکہ کے صرف نامور قومی اخبارات بشمول نیو یارک ٹائمز اور کئی چھوٹے مقامی اخبارات ہی شامل نہیں تھے بلکہ بین الاقوامی اشاعتی ادارے بھی شامل تھے۔ جن میں برطانوی اخبار دی گارجین بھی اِس مہم کا حصہ تھا۔ اقوام متحدہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ٹرمپ کے اِس بیان نے صحافیوں کے خلاف تشدد کو بڑھایا ہے۔

ٹرمپ نے ہمیشہ اپنی پریسیڈنسی (عہدہ صدارت) کو ریالٹی شو کے طور پر مانا ہے۔ اور ہر اچھے ریالٹی شو کو ایک ولن کی ضرورت ہوتی ہے۔ روزِ اول سے ٹرمپ یہی چاہتے تھے کہ میڈیا اُن کا ولن یا دشمن بن جائے۔ ٹرمپ کا صحافیوں کے ساتھ الجھنے کا یہ کوئی پہلا معاملہ نہیں ہے۔ اِس سے قبل بھی ٹرمپ نے کئی مرتبہ ایسی حرکت کی ہے۔ سی این این کی خاتون صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار ابی فلپ کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اُنہوں نے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا کہ ''آپ احمق ہیں، مَیں آپ کو برابر دیکھتا رہتا ہوں، آپ ڈھیروں احمقانہ سوال کرتی ہیں۔'' آپ سوچیں کہ کیا اِس قسم کے فقرے کسنا کسی صدر کو زیب دیتا ہے؟

یہ خوش آئند بات ہے کہ امریکہ کے ایک سے زائد خبر رساں ادارے جو ایک دوسرے کے سخت حریف ہیں، مختلف نظریات کے باوجود سی این این کے جم اکوسٹا کی حمایت میں ٹرمپ انتظامیہ کے فیصلہ کے خلاف احتجاج کرنے کیلئے متحد ہیں۔ سی این این انتظامیہ نے مقدمہ میں الزام لگایا کہ اکوسٹا پر پابندی خفیہ سروس کے تحت لگائی گئی ہے جو سی این این کے پہلے اور پانچویں ترمیمی حقوق کے خلاف ورزی ہے۔ اکوسٹا کا پریس کارڈ معطل کئے جانے کے خلاف سی این این نے پوری مضبوطی سے قانونی چارہ جوئی کرتے ہوئے عدالت سے رجوع کیا۔ جس پر ابتدائی دلائل سننے کے بعد عدالت نے صحافی کا پریس کارڈ بحال کرنے کا حکم دیا۔ یہ دنیا کی قدیم ترین جمہوریت کی پختگی ہے۔

ٹرمپ کی یہ حرکت اِس بات کی واضح دلیل ہے کہ امریکہ میں بھی آزادی صحافت خطرے میں ہے۔ ٹرمپ صحافتی آزادیوں کو دبا رہے ہیں۔ امریکہ میں آزادی صحافت کے خلاف جس طرح کے اقدامات کئے جا رہے ہیں وہ قابلِ مذمت ہیں۔ قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اِس معاملے کے ساتھ صدر ٹرمپ اور سی این این کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوا ہے کیونکہ سی این این اکثر اوقات صدر ٹرمپ کی برہمی کا نشانہ بنتا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ٹرمپ اپنی انتظامیہ یا پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنے والی خبروں کو جعلی خبریں کہتے ہیں۔ کیا اب امریکی جمہوریت میں صدر سے سوال کرنے پر بھی قدغن لگا یا جائے گا؟

ہندوستانی طبقاتی سماج : چند قابل توجہ پہلو

| اسامہ اکرم

انسانی سماج میں ہمیشہ سے ایک خاص گروہ کے ذریعہ اپنے مفادات کی غرض کے لئے ایسے محرکات پیدا کئے گئے ہیں جن کی بنیاد پر سماج کو کھڑا کیا جائے۔ جس میں ایک خاص طبقہ کو آرام دہ زندگی میسر ہو اور دوسرے طبقات اس کی خدمت کرسکیں۔ جیسے یورپ میں وائٹ سپریمیسی کا تصور، اسی طرح ہندوستانی سماج میں ذات پات کا نظام ویدک زمانہ میں برہمن طبقہ کے ذریعہ شروع کیا گیا۔ جس کی بناء پر دلت طبقہ پر ناانصافی اور ظلم کی ایک داستان کا آغاز ہوا۔ اور پھر ذات پات کا نظام ہندوستان کے سسٹم کا نا قابل فراموش حصہ بن گیا۔ مسلمانوں کا اپنے نظریہ کی بنیاد پر اور ہندوستانی سماج کا حصہ ہونے کی حیثیت سے اسے موضوع بحث بنانا، جائزہ لینا اور ان مسائل کے حل کے لئے جدوجہد کرنا ان کی اہم ذمہ داری ہے۔

ذات پات کا نظام انتہائی غیر معقول نظام ہے۔ ایک انسان صرف اپنی پیدائش کی بنیاد پر اچھوت کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس کا ایک خاص گروہ یا ایک خاص بستی میں پیدا ہونا اسے قابل نفرت کیسے بنا سکتا ہے؟ ایک انسان اپنی پہچان کی وجہ سے ظلم وزیادتی کا شکار ہوتا ہے۔ ذات پات کی بنیاد پر جب انسانوں کے درمیان تفریق کی گئی اس کے نتیجہ میں انہیں حقیر تصور کیا گیا۔ اور جسمانی اور ذہنی ہر قسم کی زیادتی کا شکار بنایا گیا۔ یہ نفرت، ظلم و زیادتی کچھ سالوں پہلے کی نہیں بلکہ صدیوں سے چلی آرہی داستان ہے۔ جو ہندوستان کی سماجی تاریخ کا اہم حصہ بن چکی ہے۔ اس لمبے عرصہ سے ہو رہے ظلم و ناانصافی کے نتیجہ میں دلت/ پسماندہ طبقہ سماجی ترقی کی دوڑ میں کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اس طبقہ کے حقوق کی بات کرنا اور اس کے لئے میدان عمل میں اترنا ہندوستانی سماج کی اصلاح اور مبنی بر انصاف ترقی کا تقاضہ ہے۔ طبقاتی نظام کو موضوع بحث بناتے ہوئے ان کے طویل المیعاد حل کے سلسلے میں کچھ وقتی پروگرام بنانا ضروری ہے۔ تاریخی طور پر پیچھے رہ گئے سماج کو ترقی کی دوڑ میں لانے کے لئے لازم ہے کہ ان کے لئے تعلیم، نوکریوں اور ایڈمنسٹریشن میں خاص تحفظات ہوں۔ تاکہ اس سماج کا نوجوان طبقہ بنیادی تعلیم آسانی سے حاصل کر سکے، اعلی تعلیم کے بھرپور مواقع حاصل ہوں اور اسے روزگار فراہم کیا جائے۔ ان سب کے مدنظر دلت اور دوسرے پسماندہ طبقات کے لئے ریزرویشن تجویز کیا گیا۔

یہاں سوال اٹھتا ہے کہ کیا ریزرویشن کوئی حل ہے؟ یہ بات توصحیح ہے کہ ریزرویشن کوئی مستقل حل نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ کے حل کا ایک چھوٹا ذریعہ ہے۔ تمام انسانوں کو سماج میں یکساں مواقع حاصل ہوں، سماج کے ہر انسان کو تعلیم حاصل کرنے، روزگار حاصل کرنے اور سماج میں ترقی کرنے کی راہیں یکساں طور پر کھلی ہوئی ہوں یہ ایک مستقل حل ہے۔ لیکن یہ ریزرویشن کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ یکساں مواقع کا حصول اسی وقت کارگر ہوگا جب سماج کے تمام ممبرس کی یکساں حالت ہو۔ مثلا کلاس میں کسی مسابقہ مضمون نویسی کا اعلان ہو۔ جس میں شرکت کرنے کے لئے دس روپیہ فیس طے کی جائے۔ اور انتظامیہ کے ذریعہ کہا جائے کہ تمام طلبہ کو یکساں مواقع ہیں کہ وہ انعام حاصل کرسکیں۔ لیکن وہاں وہ طلبہ بھی ہیں جو فیس ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جس کی بنا پر وہ طلبہ مسابقہ میں حصہ نہیں لے سکتے۔ ان طلبہ کا حصہ لینا اور مقابلہ کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ ادائیگی فیس کی شرط نہ ہو۔ ایسی صورت میں آپ انتظامیہ کے "یکساں مواقع" کے دعوے کو معقول گردانیں گے؟ یا ممبئی کی غریب بستی سے آنے والا اور ایک ہائی فائی اسکول سے تعلق رکھنے والے دونوں طلبہ سے کہا جائے کہ آپ کے پاس آئی اے ایس بننے کے یکساں مواقع ہیں۔ تو ایسی صورت حال میں "یکساں مواقع" کہنا مبنی بر انصاف ہوگا؟ مختصرا یہ کہ حالت کے یکساں ہونے کے بغیر مواقع کے یکساں ہونے کی بات غیر معقول ہے۔ اس کے ذریعہ ناانصافی کا خاتمہ نہیں بلکہ ناانصافی کا بڑھ جانا یقینی ہے۔ جس طریقہ سے برہمن ازم نے طبقاتی نظام کا تحفظ کیا اسی طرح طبقاتی نظام کے ذریعہ ہو رہی ناانصافی سے نمٹنے کے لئے خصوصی رعایات اور مراعات کا حاصل ہونا لازمی ہے۔

بحیثیت امت مسلمہ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی سماج میں رہتے ہوئے ہم نے اپنے فرض منصبی کے سلسلے میں کیا کوششیں کیں؟ ہم مظلوموں کے ساتھ کھڑے ہونے والے اور ان کی دادرسی کرنے والے لوگ ہیں۔ اور موجودہ ہندوستان میں ہماری اپنی اس پہچان کا کتنا تعارف ہوسکا ہے؟ آیا ہم صرف نری تنقید اور ان کی غلطیوں کی نشان دہی میں مصروف ہیں یا ان سے اظہار ہمدردی اور اظہار محبت کے جذبات بھی رکھتے ہیں؟ ہندوستانی مسلمان سماج کا مشاہدہ تو یہ بتاتا ہے کہ یہاں کے سماج کے زیر اثر مسلم سماج میں بھی ذات پات کسی حد تک داخل ہو چکا ہے۔ ان کا بھی صفائی کرنے والے دلت طبقہ سے کہیں نا کہیں دوری بنائے رکھنے کا رویہ ہے۔ خود مسلمانوں کے درمیان شادیوں کے سلسلے میں ڈھیروں مسائل ہیں جنہیں موضوع بحث بنانا چاہئے۔ مسلمانوں میں

الگ الگ طبقات کی بنا پر ریزرویشن پر بھی سوچا جانا چاہئے۔ کیا مسلمانوں میں صرف مخصوص طبقہ کو ریزرویشن دینا (جب کہ مسلمانوں میں ذات پات کی نوعیت مختلف ہے) ان میں طبقاتی نظام کو مزید مضبوط نہیں کر رہا ہے؟ جب کہ ''انصاری سماج'' اور ''دوسرے مسلمانوں'' کے درمیان سماجی معاشی اور سیاسی سطح پر بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو ریزرویشن بحیثیت مسلمان ملے، اس نقطہ پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ مختصرا یہ کہ ہندوستانی سماج کی گہری سمجھ دورحاضر کی ضرورت ہے۔ صرف ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم کا بیان نہیں بلکہ اس کا عملی نمونہ مسلمانوں کو پیش کرنا ہوگا۔ ناانصافی پر مبنی اونچ نیچ کے اس نظام کے خلاف مہم کا آغاز کرنا ہوگا۔ نوجوان اور طلبہ طبقہ کو اس پر غور وفکر کی دعوت دینا اور اس سلسلے میں گھر گھر تک پہنچنا اور لوگوں میں مساوات اور بھائی چارہ کی تعلیم کے تعلق سے تازہ بیداری کی ضرورت ہے۔

آخری پہلو یہ ہے کہ ہم دلت اور مظلوم طبقات کے ساتھ جدوجہد میں شریک ہوں لیکن اپنی پہچان ''اخرجت للناس'' کو تازہ کرتے رہنا ضروری ہے۔ ہمارا کام صرف اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھانا نہیں ہے بلکہ ہم دوسروں کو حق اور انصاف دلانے والی امت ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ خالق کائنات نے سب کو عزت اور شرف بخشا ہے۔ اگر سماج میں کسی انسان کی عزت پامال کی جائے گی تو ہم اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ ہماری پہچان ایک داعی امت کی ہے۔ یہ جذبہ جب جب تازہ ہوگا احساس مظلومیت کا شکار ہونے سے ہم دور رہیں گے۔ اور احساس مظلومیت کے ساتھ کار دعوت تو بعید کچھ کونٹر پیبوشن کی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ اور داعی امت کی ذمہ داری ہے کہ سماج کی اصلاح کا کام کرے اور اپنا پیغام عام کرے۔

مسئلہ

| خزیمہ عظیم الدین

''آپ کو کیا لگتا ہے کیا حل ہے؟'' فیض نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

''کس بات کا؟'' زید نے سوال کیا۔

''یہی۔۔۔ تنظیم میں موجود اس مسئلہ کا۔ سچ پوچھو تو کچھ کام کرنے کا دل ہی نہیں کرتا اب۔''

زید، فیض سے عمر میں بڑا تھا اور تنظیم کا بھی کافی پہلے سے حصہ تھا، تنظیمی معاملات میں فیض کی رہنمائی کرتا اور اس کو کوئی پریشانی درپیش ہوتی تو وہ اسے راہ دکھاتا تھا۔ فیض کو تنظیم کے ساتھ زید سے بھی بہت محبت تھی۔ فیض اس وقت تنظیمی دفتر کا ملازم تھا اور زید کچھ دنوں کے لئے کسی کام کی غرض سے دفتر میں آیا ہوا تھا۔ جب بھی زید دفتر میں آتا دونوں کا معمول تھا کہ رات کے کھانے کے بعد وہ ٹہلنے نکلتے اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی۔ اس وقت تنظیم میں ہو رہے کچھ معاملات فیض کی پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ اور وہ اسی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔

''دیکھو فیض، جہاں تک امین کا معاملہ ہے۔ تو وہ بالکل طلحہ کا فین ہے۔ طلحہ جو کہتا ہے اس کے لئے اصل کام وہی ہے۔ اس کے لئے تنظیم صرف اور صرف طلحہ ہی ہے۔'' زید نے سنجیدگی سے کہا۔

''امین کو مقصد زندگی دینا جبکہ وہ بالکل عام سا طالب علم تھا یہ طلحہ کا ہی کام ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہوئی نا؟'' فیض نے پوچھا۔

''بہت اچھی بات ہے۔ کسی بے مقصد نوجوان کو راہ راست پر لانا۔ وہ بھی اتنے عظیم مقصد کے تحت۔'' زید کچھ دیر خاموش ہوا پھر کہنے لگا۔

''لیکن شیطان راہ راست پر بھی تو بیٹھا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی محنت ان لوگوں پر زیادہ ہوتی ہے جو راہ راست پر ہیں، جو اس کے چنگل میں نہیں ہیں۔ وہ انہیں اتنی چالاکی سے بہلاتا ہے کہ خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور کئی دفعہ تو ہم گناہ کے کام کر بیٹھتے ہیں عین ثواب کا کام سمجھ کر۔''

''لاشعوری طور پر؟''

''ہاں۔ لاشعوری طور پر۔'' زید نے تصدیق کی۔

''تو ان کی نیت گناہ کرنے کی نہیں ہوتی۔ وہ تو یہ کام تنظیم کی بہتری کے لئے کرتے ہیں۔''

''یقیناً انکے خیال میں یہ کام تنظیم کی بہتری ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن بہتان لگانا، جھوٹ بولنا، چالیں چلنا، اور معاملے کی حقیقت کو جانے بنا بدگمان ہونا، کسی مخصوص سوچ رکھنے والے فرد کے خلاف لوگوں میں باتیں کرنا کسی صحیح مقصد کے لئے بھی جائز نہیں۔ اچھی نیت سے برے کام کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟'' زید تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔

پھر کہا، ''معاف کرنا میں بہت سخت الفاظ کہہ گیا لیکن میں مجبور ہوں یہ سب کہنے کیلئے۔ بات در

اصل یہ ہے کہ شیطان بڑی چالاکی سے ہمیں ہمارے اعمال کا جائزہ تک لینے نہیں دیتا۔''

''اتنے لوگوں میں کسی کا بھی خیال نہیں جاتا ہوگا اس طرف؟'' فیض نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''جب کچھ افراد ایک گروپ کی شکل لیتے ہیں تو انکی انفرادی سوچ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جن بے چاروں کے دل میں کھٹک ہوتی بھی ہوگی تو وہ اسے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس ڈر سے کہ جن سے وہ محبت کرتے ہیں، ناراض نہ ہو جائیں۔ گروپ میں ہر فرد کی سوچ ایک ہوتی ہے۔ درمیان میں اگر کسی کا ضمیر بیدار بھی ہوتا ہے تو لاشعوری طور پر وہ اس دستک کو دبا دیتا ہے۔''

''اچھا۔۔'' فیض نے کچھ سوچتے ہوئے حامی بھری۔

''لیکن ایک وقت آتا ہے کہ فرد ان دھیمی دھیمی لیکن مستقل ہونے والی دستک کو سن لیتا ہے۔ اور دروازہ کھول کر اس جنجال سے باہر نکل آتا ہے۔'' زید نے نہ جانے کیوں دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیا بات ہے؟'' فیض نے اس چھپی مسکراہٹ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں بس کچھ ایسے لوگ یاد آگئے۔۔۔ پتہ نہیں کیوں لیکن اس طرح گروپ سے الگ ہونے والے افراد کی میرے دل میں بہت عزت اور محبت ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو منہ اوندھائے نہیں بلکہ سر اٹھائے سیدھے راستے پر چل رہے ہیں۔''

''اچھا! ایسے لوگ ہیں تنظیم میں؟'' فیض نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ہیں۔ کیوں نہیں؟ تم نے تنظیم کے افراد کو اتنا گیا گزرا سمجھ کر رکھا ہے کیا؟'' زید نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں۔۔۔ مجھے ایسے کسی فرد کا پتہ نہیں اسی لئے پوچھا'' فیض نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ہاں اس بات سے میں بالکل متفق ہوں کے ایسے لوگ اچانک غائب ہو جاتے ہیں۔''

''کون غائب کر دیتا ہے انھیں؟'' فیض نے حیران ہوتے ہوئے ایسے پوچھا جیسے پتہ نہیں کون اغوا کر لیتا ہوگا ایسے افراد کو۔

''کس کی مجال کے وہ انھیں غائب کردے، وہ دراصل خود اپنے آپ کو غائب کر لیتے ہیں اس جنجال سے پیچھا چھڑانے کے لیے۔''

''مطلب۔۔۔؟''

''ایسے افراد خود کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اب وہ ان سب معاملوں میں نہیں پڑینگے۔''

''صحیح تو ہے۔۔۔ انکی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ چپ چاپ اپنے کام سے کام رکھو کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔''

''شاباش! تم سے یہی امید تھی۔۔۔'' فیض نے غصیلے انداز میں کہا۔

''کیوں اس میں کیا غلط ہے۔؟'' فیض نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔۔۔ کچھ غلط نہیں ہے؟'' زید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''سوائے اس کے کہ جو لوگ حقیقت میں اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں وہی ایک طرف بیٹھ جائیں اور نا امیدی کی باتیں کریں۔ کہ تنظیم میں اب کچھ اچھائی باقی نہیں رہی اور اسکا کچھ نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ انکی باتوں کی مخالفت میں وہ خود ایک جیتی جاگتی دلیل ہے۔''

''مطلب؟'' فیض نے معصومیت سے پوچھا۔

''یہی کہ لوگ تبدیل ہو سکتے ہیں۔''

''ہاں۔۔۔'' فیض نے منہ کھول کر کہا جیسے اسے اب ساری بات سمجھ میں آگئی ہو۔

چہل قدمی کرتے ہوئے دونوں دوست چائے کی ہوٹل پر پہنچ چکے تھے۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بات دوبارہ شروع ہوئی۔

''تنظیم کا مقصد کیا ہے؟'' زید نے سمجھانے کی شروعات کرتے ہوئے پوچھا۔

''اچھائی کا قیام'' فیض نے بلا جھجھک کہہ ڈالا۔

''قیام ہی کیوں؟ صرف 'اچھائی پر عمل' میں کیا حرج ہے؟ کہ بس ہر فرد اچھائی کو اپنے حد تک ہی رکھے، کیا ضرورت ہے اسے معاشرہ میں قائم کرنے کی؟ ہر فرد اچھا ہو جائے تو معاشرہ خود بہ خود اچھا ہو جائے گا۔''

فیض نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا:''شاید اسی لئے کہ ہر فرد اچھا ہو جائے ایسا ضروری نہیں۔ معاشرہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ برے افراد رہتے ہی ہیں۔ اگر اچھے افراد حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرنا چھوڑ دیں تو یہ افراد ہیں ہی اپنے ایجنڈوں کو نافذ کرنے کے لئے تیار۔''

''بالکل صحیح!'' زید نے توقع کے مطابق جواب سن کر کہا۔''اب یہی معاملہ تنظیم میں بھی دیکھ لو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی فرد دانستہ طور پر تنظیم کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ بلکہ کسی فرد سے غلطی ہو جاتی ہے۔''

''اتنی بڑی؟'' فیض نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''شروعات میں غلطیاں اتنی بڑی نہیں ہوتی۔ شروع میں تو غلطیاں چھوٹی ہوتی ہیں اگر اسی وقت کوئی ٹوک دے تو فرد سنبھل جائے۔ لیکن ہماری نظرانداز کرنے کی عادت۔۔۔اف''

زید نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا''ہمارے اکابرین اس معاملہ میں کہتے ہیں کہ ہر رکن اجتماعیت کا سنتری یعنی گارڈ ہوتا ہے جو جہاں کوئی غلطی دیکھتا ہے اسے سدھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ ذرا سوچو اگر ہر فرد اس کام کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر کرنے لگے تو غلطی کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔''

''سب کا تو پتہ نہیں لیکن میں تیار ہوں۔ بتائیے کہاں سے شروع کروں؟ سیدھے طلحہ بھائی سے یا پہلے امین کے پاس جاؤں؟''

''اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' زید نے ہنستے ہوئے کہا۔''ان لوگوں کا تم سے کیا معاملہ بھلا؟ اگر تم کو کوئی آکر اس طرح کے کام میں ملوث کرے تو تمہارا فرض بنتا ہے اسے نصیحت کرنے کا ورنہ تمہیں کچھ لینا دینا نہیں ہونا چاہئے ان لوگوں سے۔ ان سے جاکر کیا کہو گے کس نے بتایا تمہیں ان سب چیزوں کے بارے میں؟''

''اگر ایسا ہے تو اسکا مطلب ہمیں بھی یہ سب باتیں نہیں کرنی چاہئے۔۔۔'' فیض نے کہا۔

''اصولی طور پر تو تمہاری بات صحیح ہے'' زید نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ پھر فیض نے سوال کرتے ہوئے خاموشی کو توڑا۔

''آپ کہہ رہے تھے کہ جو لوگ الگ ہو جاتے ہیں وہی لوگ اصل میں اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔۔۔''

''ہاں۔ کیوں کہ انھیں افراد کو معاملہ کی جڑ پتہ ہوتی

ہے اور چونکہ یہ افراد گروپ بندی کرنے والے افراد کے کبھی نزدیکی ہوا کرتے تھے تو شاید انکے مخلصانہ احساس دلانے پر وہ سنبھل جائیں۔‘‘

’’اور اگر یہ سدھرنے کا نام ہی نہ لیں تو؟‘‘

’’تو۔۔۔انھیں ایسے مقام پر ان کے راز کھول دینے چاہئے جہاں موقع ہو۔ تاکہ اسطرح کہ افراد اور انکی ایکٹیویز دوسرے متعلقہ افراد کے سامنے آجائے اور تنظیم کے افراد کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے۔‘‘

’’بہرحال اللہ تعالی ہمیں اور ہماری تنظیم کو ان برائیوں سے بچائے۔آمین‘‘ فیض نے گفتگو کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر میں وہ دونوں گھوم کر دفتر تک پہنچ چکے تھے۔اور وہاں پہنچ کر زید کچھ کام میں مصروف ہوگیا اور فیض سونے کی تیاری کرنے لگا۔

نئی نسل کی تربیت اور ہمارا معاشرہ

شاہد میاں، بدایوں

نئی نسل کی تعلیم وتربیت میں معاشرہ کا اہم کردار ہوتا ہے۔تعلیم کے ذریعہ انسان جانتا ہے اور تربیت کے ذریعہ انسان کے اندر ماننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں ہی باتیں ضروری ہیں۔تعلیم سے محرومی ایمان سے محروم ہونے کے سب سے بڑا نقصان ہے۔ جو شخص علم سے محروم ہو اس کی مثال آنکھوں سے محروم شخص کی طرح ہے۔لیکن اگر تربیت نہیں ہوئی اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ظالم اور مظلوم میں فرق نہیں کرتا۔ پہلا شخص اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا اور دوسرا شخص سماج اور معاشرہ کو۔ تعلیم وتربیت سے محروم انسان کا تکبر، اس کی زبان درازی، دوسروں کی حق تلفی اور رشوت کی گرم بازاری پورے سماج کو بے سکون بنادیتی ہے۔

اس لیے اسلام نے جہاں تعلیم حاصل کرنے اور اپنے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے پر زور دیا ہے وہیں خاندان اور سماج کے ذمہ دار لوگوں کو اپنے چھوٹوں کی تربیت کی بھی نہایت تاکید کے ساتھ تلقین کی ہے۔نماز کا حکم دینے کے ساتھ اپنے اہل وعیال کو بھی نماز کی تلقین کرنے کا حکم دیا۔

تربیت میں عام طور پر تین عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اساتذہ، والدین اور دوست واحباب۔استاد سے شاگرد صرف ان مضمون کو نہیں پڑھتے جو نصاب کا حصہ ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اساتذہ سے بول چال، اندازِ ملاقات اور بہت کچھ سیکھتے ہیں اور پڑھنے والے پر ان کی گہری چھاپ پڑتی چلی جاتی ہے۔مگر افسوس کہ آج کل اساتذہ سے طلبہ خوبیوں کے بجائے کمزوریوں کو اخذ کرتے ہیں۔افسوس کے کام چوری، ناشائستہ گفتگو، نامناسب رویہ اور فرض شناسی کا سبق اکثر وہ اساتذہ سے ہی سیکھتے ہیں اور اپنی آئندہ زندگی میں اس کو دہراتے ہیں۔

والدین پر اولاد کی تربیت کا خصوصی ذمہ داری ہے کیونکہ ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ خود کیسا بھی ہو اس کے بچے اچھے ہوں مگر تین باتیں تربیت میں رکاوٹ بنتی ہیں ایک تو ماں باپ کی جہالت۔مسلم معاشرہ میں آج بڑی تعداد ایسے والدین کی ہے جو اپنی اولاد کی تربیت کی صلاحیت نہیں رکھتے دوسرے زیادہ تر والدین معاشی تنگ ودو کی وجہ سے بچوں کی تربیت پر توجہ نہیں دیتے۔ کچھ والدین جو پڑھے لکھے ہیں اور بچوں کی تربیت بھی کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے نزدیک دنیوی زندگی کی ترقی کے لیے بچوں کو تیار کرنا ہے۔اخلاقی تربیت کی ان کے یہاں کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔

تربیت کا تیسرا ذریعہ انسان کے دوست و احباب ہیں۔بعض اوقات انسان مدرس اور ماں باپ سے بڑھکر قریبی دوستوں کا اثر قبول کرتا ہے۔موجودہ دور میں سماجی بگاڑ کی وجہ سے عام طور پر تعلیمی اداروں میں جو صحبت ملتی ہے وہ ان کو فائدہ کم اور نقصان بہت زیادہ پہنچاتی ہے۔ اس لئے تربیت عنصر بالکل ختم ہوجاتا ہے اسی لئے معاشرہ میں جیسے جیسے تعلیم بڑھتی جاتی ہے اخلاقی اقدار تباہ ہوتی جارہی ہے۔

یہ صورت حال اس وقت اور بھی زیادہ پریشان کن ہوتی ہے جب ابتدائی تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے دوسرے شہروں میں جاتے ہیں۔وہاں نہ تو والدین کی نگرانی ہوتی ہے اور نہ اچھے مدرس ملتے ہیں۔اس وجہ سے وہ بگاڑ کی طرف چلے جاتے ہیں۔

شہروں میں دیکھ بھالی اور تربیت کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے سماجی برائیوں کے واقعات پیش آتے ہیں وہ روزانہ اخبار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے ہاسٹل تعمیر کئے جائیں کہ وہاں تربیت کا نظم ہو۔اگر دینی مدارس ہاسٹل قائم کریں تو یہ بہت ہی مفید صورت ہوگی اس طرح ہم قوم کے بہت سے بچوں اور بچیوں کو گمراہ ہونے سے بچاسکیں گے اور عصری تعلیم سے آراستہ ہوکر ملازمتیں حاصل کریں گے تو بہتر طریقے سے اپنے کاموں کو انجام دے سکیں گے۔

بھٹکے ہوئے مسافر کی سب سے بڑی خیرخواہی یہ ہے کہ اسے صحیح راستے کی جانکاری دے دی جائے۔ اگر جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس کی رہ نمائی نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ اپنی منزل کھوٹی کر لے گا۔ اسی طرح دنیا کی اس چندروزہ زندگی میں بھی انسان کی سب سے اہم اور بنیادی ضروری یہی ہے کہ وہ اپنے آپ سے اور اپنے مالکِ حقیقی سے واقف ہوجائے کیونکہ اس کے بغیر اس کی شخصیت ادھوری ہے اور دونوں جہاں کی ناکامی یقینی ہے۔حق تعالی شانہ کی جانب سے یہ عظیم ذمہ داری امت مسلمہ کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے کہ وہ ابنِ آدم کو خداشناس اور خودشناس بنائے۔لیکن افسوس امت کا بڑا حصہ اپنی اس اہم ذمہ داری سے منہ موڑے ہوئے ہے۔

زیرِنظر کتاب ’’پیغامِ حق کی ترسیل‘‘ محترم جناب اقبال ملا صاحب نے رقم کی ہے۔ فاضل مصنف دعوتِ دین کے میدان کے شہسوار ہیں۔ مصنف کا احساس یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے سلگتے مسائل کا بنیادی حل دعوتِ دین کے فریضے کی ادائیگی میں پنہاں ہے۔ یہی نکتہ اس کتاب کا مرکزی موضوعِ سخن ہے۔ اس اہم کتاب کا پیش لفظ محترم مولانا محمد فاروق خاں صاحب نے تحریر کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ ’’دین سراپا خیر ہے اور قابلِ قبول وقابلِ عمل ہے۔ وہ جیسا ہے ویسا ہی پیش کریں۔ ایمان کے دعویدار اگر ایسا نہیں کرتے تو دنیا میں اس سے بڑا ستم دوسرا نہیں ہوسکتا۔‘‘ (ص ٦)

نام کتاب	پیغامِ حق کی ترسیل اور اہمیت اور لائحۂ عمل
تلخیص وترجمہ	محمد اقبال ملا
صفحات	۲۴
اشاعت اول	جولائی ۲۰۱۸ء
قیمت	۲۰/روپے
ناشر	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی
مبصر	محمد معاذ

کتاب کی ابتدا ہی میں فاضل مصنف دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس حقیقت کا بجا طور پر اظہار کرتے ہیں کہ ’’فریضۂ دعوت کی ادائیگی فطری انداز میں ہوسکتی ہے، روزمرہ کی زندگی میں سیدھے سادے طریقے پر انسانوں سے بات چیت ہونی چاہیے۔ محض تقریروں، کتابوں، فولڈرس اور تبادلۂ خیال سے یہ فریضہ انجام نہیں پاتا، بلکہ دعوت دینے والے فرد یا گروہ کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔‘‘ (ص ٩)

محترم فاضل مصنف نے دعوتِ دین کا کام انجام دینے والوں کے دل میں اٹھنے والے موہوم اندیشوں اور شیطانی وساوس کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس اہم اور ضروری نکتہ پر زور دیا ہے کہ داعی پہلے قدم پر ہی کامیاب ہے اس راہ کا ہر قدم مبارک ہے اور ہدایت دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ (انَّ عَلَیْنَا لَلْہدیٰ، اللیل: ١٢) بے شک ہمارے ذمے ہے راستہ بتانا۔

اسی طرح مصنف نے دعوت کے میدان میں کام کرنے کے لیے اصل شرط کا ذکر کرتے ہوئے ایک پتے کی بات یہ لکھی ہے کہ ’’دعوت کے لیے ڈگری، تعلیمی قابلیت یا ہنر شرط نہیں یہ سب ہوں تو دعوت کے کام میں مددگار ہوں گے۔ جو شرطِ اول ہے وہ یہ کہ دعوت کا جذبہ ہو، انسانوں سے محبت ہو، انہیں جہنم کے خوف ناک عذاب سے بچانے کی فکر ہو۔ حق بات کو پیش کرنے کی جرأت ہو۔ حق کے بارے میں کوئی ڈر، خوف نہ ہو اور کسی سے مرعوبیت نہ ہو۔‘‘ (ص: ١٢)

عملی میدان میں داعی کو سرد وگرم دونوں طرح کے رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مصنف کو بھی اس حقیقت کا احساس ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ’’فرض کیجیے، کسی مقام پر داعی کو مخاطبین سے حوصلہ افزا جواب نہیں ملتا یا منفی رویہ سامنے آتا ہے۔ ایسے مواقع پر دعوتی گفتگو نہ ہوسکے تب بھی انسانی تعلقات کو قائم کر کے رکھنا چاہیے۔ توقع ہے کہ آپ کے حسنِ اخلاق اور سلوک سے مخاطب ضرور متاثر ہوں گے۔‘‘ (ص ١٦)

اس کتاب کے آخر میں مصنف نے ’’وحدتِ ادیان‘‘ (Unity of Religions) کا مختصر اور جامع جائزہ عقلی بنیادوں پر لیا ہے اور اسلام کا موقف واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ دعوتِ دین کی علمی تیاری کے سلسلے میں بھی رہ نما خطوط رقم کیے ہیں۔ اس کتاب میں ’’مصنف کے بجائے‘‘ ترجمہ وتلخیص لکھا ہے۔ جبکہ سرورق پر بھی مصنف کا ہی نام ہے۔ کتابت کی غلطیاں بھی جا بجا ہیں۔

الغرض یہ مختصر کتاب داعیانِ اسلام کی راہ نمائی کا اچھا سامان کرتی ہے امید ہے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

اے بنتِ حوّا

| بنتِ رفیع

آج پھر وہی ہوا۔ وہی بات جس سے کہ مجھے سخت چڑ ہے۔
میڈم کرن کلاس میں غضبناک حالت میں داخل ہوئیں۔ انتہائی طیش کے عالم میں انہوں نے 'کلاس پرفیکٹ' کو مخاطب کرتے ہوئے دریافت کیا: ''کل تم نے کالج بنک کیوں کیا تھا!'' جواب میں وہ محض سر جھکائے کھڑی رہی۔ استانی نے اسے اسٹاف روم میں بھیجا اور کلاس میں بارہا کیا ہوا اعلان پھر سے دہرایا کہ'' کالج میں حاضری لازمی ہے اور کون سی طالبہ کلاس سے باہر کیا کرتی ہے، ہمیں اس کا بخوبی علم ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کلاس سے نکل گئیں۔ لیکن پیچھے ایک دلچسپ سا عنوان چھوڑ گئیں کلاس کی تمام ہی لڑکیوں کے لیے۔ چاروں طرف سے سرگوشیاں ابھرنا شروع ہوئیں۔
''اپنے محبوب کے ساتھ گئی ہوگی۔'' پیچھے سے آواز آئی۔
''کلاس کی CR ہو کر یہ سب! ہونہہ۔'' کسی نے تبصرہ کیا۔
''اس کا بڑا زوردار چکر ہے۔'' میرے ساتھ میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے اپنے علم کا اظہار کیا۔
پھر اچانک اس نے مجھ سے پوچھا: ''تم اتنی چپ کیوں ہو؟''
کہنا تو مجھے ویسے بہت کچھ تھا مگر میں نے بس 'ہمم' پر اکتفا کیا اور دوبارہ اپنے خیال میں گم ہوگئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ خدا جانے آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہوتا جارہا ہے، کیوں کرتی ہیں وہ یہ سب خرافات؟
''کیا کسی کی یاد آرہی ہے؟'' اقصیٰ نے اپنی دانست میں بہت ہی عمدہ سوال پوچھا مجھ سے۔ لڑکیوں کا ایک ساتھ زوردار قہقہہ ابھرا۔
اتنے واہیات سوال پر میرا خود پر قابو کرنا مشکل ہوگیا۔
میں نے جواباً کہا: ''تم سب کا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا۔ کیوں تمہاری سوئی انہیں خرافات پر اٹکی رہتی ہے۔ اس دنیا میں اور بھی بہت کچھ ہے 'عاشق و معشوق' کے علاوہ۔ آخر کیا ضرورت پڑتی ہے تمہیں بوائے فرینڈز کی؟''
نوال نے اداسی سے کہا: ''جب گھر میں پیار نہیں ملتا تو باہر ہی ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔'' اتنے غصے میں بھی میری ہنسی چھوٹ گئی۔
میں نے کہا: ''دیکھو نوال! یہ سب کچھ محض بکواس ہے اور جہاں تک میں جانتی ہوں تمہارے والدین تمہیں بہت پیار کرتے ہیں۔ اور رہے بھائی بہن، تو ان کا جھگڑا اور نوک جھونک ہی تو اصل پیار ہے۔''
ایک لمحے کو ٹھہر کر میں نے اسے دیکھا اور اس سے مخاطب ہوئی: ''اچھا نوال! تم ہی بتاؤ، پیار کسے کہتے ہیں؟ کیا وہ واٹس ایپ پر موصول ہونے والے 'مسیجز' جو تمہارا بوائے فرینڈ تمہیں بھیجتا ہے! کیا وہ 'آئی مس یو' اور 'آئی کانٹ لیو وداؤٹ یو'، یہی سب پیار کے ثبوت ہیں؟ وہ شخص جو تمہیں صبح کو گڈ مارننگ اور شام کو گڈ نائٹ نہ کہے، کیا وہ شخص تم سے پیار نہیں کرتا؟ تم اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ سیر سپاٹے کے لیے کالج بنک کرتی ہو، والدین کو بے خبر رکھ کر یہ سب کام کرنا کمال سمجھتی ہو! تم خود ہی بتاؤ، جو بندہ تم سے پیار کرے گا اور جسے تمہارا خیال ہوگا، کیا اسے منظور ہوگا کہ تم یوں اپنی پڑھائی کا ضیاع کرو؟ اور سڑکوں پر کسی 'لڑکے' کے ساتھ نظر آکر گوسپ کی وجہ بنو! تم خود سوچو کہ تمہارا یہ سب کام کرنا تمہیں موزوں لگتا ہے؟ نہیں مائی ڈیئر! یہ تم سب بہت غلط کر رہی ہو۔ خود اپنے ساتھ بھی اور اپنے والدین کے ساتھ بھی۔ مجھے واقعی بہت تکلیف ہوتی ہے جب تمہیں یہ سب کرتا ہوا دیکھتی ہوں!''
مجھے احساس ہوا کہ میری آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہے اور پوری کلاس خاموشی سے مجھے سن رہی ہے۔
میرے خاموش ہوتے ہی کلاس تالیوں سے گونج اٹھا۔ کچھ کی آنکھوں میں تحسین اور کچھ کی نگاہوں میں تمسخر۔
میں نے ایک وقفے کے بعد دوبارہ کہا۔
''سنو گائیز! مجھے تمہاری ان تالیوں کی ضرورت نہیں ہے، مجھے ضرورت ہے تو بس تمہارے ایک قدم کی، ایک چھوٹا سا قدم جو اس برائی کو سماج سے اور اس نسل سے مٹانے میں مددگار ثابت ہو!''

دفعتاً پیریڈ بیل کی آواز ہوئی اور مس شمع کلاس میں داخل ہوئیں۔ میں خاموشی سے اپنی ڈیسک پر بیٹھ گئی۔
چھٹی ہوتے ہی میں کلاس سے باہر نکلی۔ کیمپس میں جا بجا اُسی قسم کے 'نمونے' موجود تھے۔ میری وحشت اور بڑھ گئی، میں نے سوچا کہ انتظامیہ کے اتنے سخت ماحول کے باوجود یہ حال ہے، خدا کا شکر کہ کم از کم یہاں دیگر کالجوں جیسی آزادی نہیں!
کلاس میں اتنا کچھ بولنے کے باوجود بھی میری بھڑاس کم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے گھر پہنچتے ہی ڈائری نکالی اور اپنے جذبات کو ڈائری کے صفحات کے حوالے کر دیا۔
کہاں جا رہی ہے آج کی یہ نسل؟ کیوں لڑکیاں ان فضول کاموں میں پڑ کر اپنے قیمتی وقت اور والدین کے بھروسے کو برباد کر رہی ہیں؟ یہ 'ماڈرن ازم' کا شکار لڑکیاں اور یہ مغرب پرستی ہمارے معاشرے میں کیسی کیسی برائیاں لا رہی ہیں؟ کیا اس ابھرتی برائی کا کوئی حل نہیں؟ وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے کہ ہمیں اس کے تدارک کے لیے کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔

اے بنتِ حوا!
ٹھہر جاؤ ذرا
ابھی وقت ہے
تو سنبھل جاؤ ذرا
نہ ان پستیوں میں
تو خود کو گرا
کہ ممکن نہ ہو
پھر ترا ارتقاء
تو اماں کی جاں ہے
تو بابا کا مان
تو عصمت کی دیوی
حیا کا نشان
اے حوا کی بیٹی!
ذرا جان لے
ہیں کتنی امیدیں
تری ذات سے

غزل

مال و دولت نہ سیم و گہر چاہیے
درد دل کے لئے چارہ گر چاہیے

لمحہ بھر کی رفاقت بھی منظور ہے
ساتھ تیرا مگر عمر بھر چاہیے

ہو گئے تار کانٹوں سے دامن بہت
اب تو پھولوں کی اک رہ گذر چاہیے

مشکلیں خود بخود دور ہو جائیں گی
بس دعاؤں میں تیری اثر چاہیے

چشم نم ہے مگر لب پہ مسکان ہے
غم چھپانے کا کچھ تو ہنر چاہیے

جل اٹھے سب دیے پھر بھی ہے تیرگی
روشنی کے لئے اب سحر چاہیے

ہم نشینوں سے اتنی سی ہے التجا
اب نہیں کوئی زخم جگر چاہیے

| ام افنان

آیتِ نحل
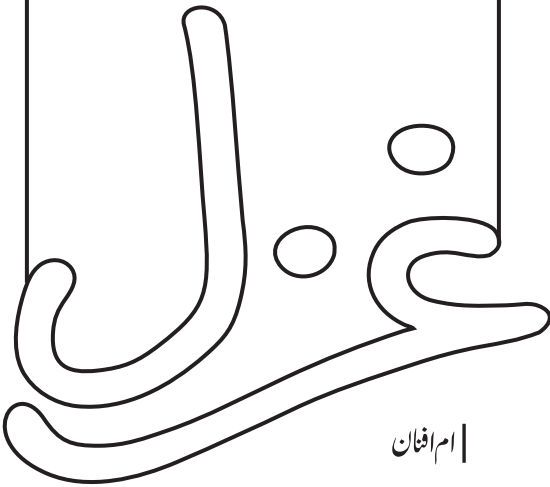
''جب مکھی گھر سے نکلتی ہے تو اس کو اپنے گھر کا راستہ برقی مقناطیسی لہروں کی مدد سے یاد رہتا ہے۔ وہ پھول، پھل پر بیٹھتی ہے اور رس لے کر واپس گھر لوٹتی ہے۔ لیکن درمیان میں موبائل سگنلز کی لہروں کا جال بچھا رہتا ہے۔ شہد کی مکھی جب کسی سگنل کی لہر سے ٹکراتی ہے، تو مقناطیسی فیلڈ متاثر ہوتا ہے، یوں سمجھئے وہ چکرا کر رہ جاتی ہے اور ''کنفیوژڈ'' ہو جاتی ہے۔ اس ٹکر سے وہ سمت کا تعین کھو دیتی ہے۔ وہ اپنے گھر کا راستہ بھول جاتی ہے۔ وہ پھر ماری ماری ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑتی ہے۔ اور یوں ہی بھٹک بھٹک کر کہیں گر کر مر جاتی ہے۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ گھر لوٹنے والی مکھیوں کی تعداد کم سے کم ہو رہی ہے۔''

جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے سوچا کہ...... یہ آیت نحل ہے، اتنی اہم جس سے سورہ کا نام لکھا ہے، تو شہد کی مکھی کی مثال بیان کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟

تب مجھے احساس ہوا کہ یہ موبائلز ہماری دنیا سے مٹھاس کیسے غائب کر رہے ہیں۔ کتنی ہی پیاری اور اچھی لڑکیاں جنھیں اپنے گھروں کی شیرینی بڑھانی تھی، وہ روز گھر سے نکلتی ہیں، پھولوں، رنگوں اور خوشبوؤں کی آس لے کر، آسان راستوں پر چلتی ہیں، مگر پھر...... درمیان میں یہ موبائل سگنلز آ جاتے ہیں، اور ان کے راستے مشکل ہو جاتے ہیں۔ وہ کنفیوز ہو جاتی ہیں۔ کسی نامحرم سے فون پر بات کرنے کے لیے ڈھیروں دلیلیں گھڑتی ہیں۔ فتوے لیتی ہیں، کزن بھی تو بھائی ہوتا ہے، اسلام اتنا بھی سخت نہیں، میں غلط بات تو نہیں کر رہی وغیرہ وغیرہ۔ اور اسی کرب اور کنفیوژن میں وہ گھر کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ وہ دربدر بھٹکتی رہتی ہیں۔ ان کو تو آسان راستوں پر چلنا تھا، اپنے دلوں میں موجود قرآن سے، اور نور سے، لوگوں کو شفا دینی تھی، اپنے ٹیلنٹ اور پوٹینشل کو میٹھے کاموں کے لیے استعمال کرنا تھا۔ مگر یہ موبائل سگنلز ان کو بیمار کر دیتے ہیں۔ مرضِ عشق بہت موذی مرض ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی اس میں مبتلا ہے تو یاد رکھیے اس مرض کی شفا ہے۔ لیکن اس شفا کے لیے پہلے آپ کو اپنے راستے ٹھیک کرنے ہوں گے۔ وہ مشکل راہیں جن میں کرب ہے، پکڑے جانے کا خوف ہے، ان کو ترک کرنا ہوگا۔

قصہ مختصر، یہ آیات نحل ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ جیسے گوبر اور خون کے درمیان سے پاکیزہ چیز نکل سکتی ہے، اور جیسے انگور اور کھجور سے ناپاک شے بن سکتی ہے، ویسے ہی شہد کی مکھی کے راستوں کو مشکل بنانے والی چیزوں کا صحیح یا غلط استعمال آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر اتنا یاد رکھیے گا کہ جو آپ کے نصیب میں ہے، وہ آپ کو ضرور ملے گا۔ چاہے حرام سے یا چاہے حلال سے۔ لیکن اگر آپ اس کو حرام سے لینے کی کوشش کریں گے، تو اللہ آپ کے حلال کی لذت لے لے گا۔

خاص بات

اپنی شخصیت کے بارے میں بلند سوچ خوشحالی کا باعث ہے۔

لندن بزنس اسکول اور این وائے یو کے دو وابستگان کے ذریعے کیے گئے ریسرچ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اپنی حیثیت کے متعلق بلند سوچ رکھنے والے افراد، ایسے افراد کے بالمقابل جو اپنے کاموں کو کم تر گردانتے اور اس کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے ہیں، ۱۹ فیصد زیادہ خوشحال رہتے ہیں۔ فرد کا اپنی ذات سے متعلق تصور دوسروں کی نظر میں اس کی حیثیت کو متعین کرتا ہے۔ قدرشناسی، آمدنی و ترقی کے حوالے سے ملنے والے حاصلات میں فرد کی اعلیٰ وارفع سوچ کا بڑا دخل ہے۔

علم یا دولت

شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ مصر میں دو امیر زادے رہتے تھے۔ایک نے علم حاصل کیا اور دوسرے نے مال و دولت جمع کیا۔آخر کار ایک زمانے کا بہت بڑا عالم بن گیا اور دوسرے کو مصر کی بادشاہت مل گئی۔

بادشاہ بننے کے بعد اس نے اس عالم کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور کہا ’’میں حکومت تک پہنچ گیا اور تیری قسمت میں غربت و مسکینی آئی۔‘‘

عالم نے کہا ’’اے بھائی! مجھے اللہ تعالی کا شکر تجھ سے زیادہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ میں نے پیغمبروں کا ورثہ یعنی ’’علم‘‘ پایا، اور تو نے فرعون و ہامان کی میراث پائی ہے۔

’’ کجا خود شکر ایں نعمت گزارم کہ زور مردم آزای ندارم‘‘

(میں اس نعمت کا شکر کیسے ادا کروں کہ میں لوگوں کو ستانے کی طاقت نہیں رکھتا یعنی بنی نوع انسان کو مجھ سے فائدہ پہنچتا ہے اور تجھ سے نقصان، پس دیکھ لے خدا کا فضل کس پر زیادہ ہے۔)

مومن محمد عدی

دلچسپ معلومات

آسٹریلیا میں کوئی گلہری نہیں پائی جاتی ہے۔

ہاتھی اور چوہے کے دانت ساری عمر بڑھتے رہتے ہیں۔

اونٹ ایک ایسا جانور ہے جو 17 دن تک پانی پیئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔

سورج میں سب سے زیادہ ’’ہائیڈروجن‘‘ گیس پائی جاتی ہے۔

شہد کی مکھی کو ’’سرخ‘‘ رنگ دکھائی نہیں دیتا۔

ہنسو ہنساو ۔۔۔۔

- ایک کنجوس شخص بازار سے گذر رہا تھا۔اس کی ایک آنکھ کھلی اور ایک بند تھی۔
  ایک شخص نے اس کی وجہ پوچھی تو کنجوس بولا ’’بھائی جب ایک آنکھ سے صاف دکھائی دیتا ہے تو دوسری آنکھ کی روشنی کیوں خرچ کرو۔‘‘
- ماہم (افہام سے) کیا تم انگریزی سمجھتے ہو؟
  افہام: اگر اردو میں بولی جائے۔
- شاہد: تمہیں بحث کرنے کی بہت عادت ہے۔ہر بات پر بحث اچھی نہیں ہوگی۔
  زاہد: اس بات پر بھی دو گھنٹے کی بحث کی جاسکتی ہے۔

ڈراؤنی کہانی

یہ ایک ڈراؤنی کہانی ہے۔کمزور دِل والے اس کو نہ پڑھیں۔برسات کی اندھیری رات میں ایک بوڑھا آدمی ایک کتاب کو بیچنے کے لئے نکلا اور اس کتاب کو ایک آدمی نے تیس ہزار روپئے میں خریدا۔بوڑھے آدمی نے کہا کہ جب تک کہ کوئی مصیبت نہ آئے اس کتاب کا آخری صفحہ نہ پڑھنا،اس آدمی نے ساری کتاب پڑھ لی اور آخری صفحہ نہیں پڑھا۔کچھ دن بعد اس سے رہا نہیں گیا۔اس نے آخری صفحہ پڑھ لیا اور صدمے سے مرگیا۔
اس صفحہ پر لکھا تھا ’’MRP Rs. 30/-‘‘

محمد صدام، اورنگ آباد

ایس آئی او کی سرگرمیوں کی تصویری جھلکیاں

تلنگانہ میں اسٹوڈنٹس مینوفسٹو کے حوالے سے سیاسی قائدین سے ملاقاتیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں نکڑ سبھا

ریاست منی پور کے سماجی کارکنان کی ایس آئی او آفس پر آمد

'ایجوکیشن ان اسمبلی' ایس آئی او کرناٹک

راجستھان میں نوعمروں کا 'جونیئر اسٹوڈنٹس فیسٹول'

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سعادت اللہ حسینی صاحب کا خطاب